سلطان حمید جوش

نذرِ بابا :

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا "مستی! از خیر گسستی و بہ شر پیوستی"

گفتا "چنانکہ می نمایم ہستم تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟"

(عمر خیام)
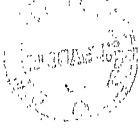
بنام علامہ

دو ریں

عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

(بقرہ)
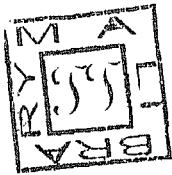
یہ ناول چہ میری دُوسری جسارت ہے۔ پہلا "ہوائی" شائع ہُوا تو
ایک بے تکلّف دوست نے اُس کو کوک شاستر کا جدید ایڈیشن کہہ ڈالا،
اور ایک کرم فرما کو شکایت ہوئی کہ مجھ سے ایسی توقع نہ تھی۔ مَیں ہر صورت
میں خاموش ہی نہیں رہا بلکہ ممنون بھی ہُوا۔

واقعی میری خامیاں، کوتاہیاں اور اعتدال کوشیاں اگر مجھے خود نظر
آنے لگیں تو شاید چشمِ ظاہر بیں کی بصارت غائب ہو کر بصیرت پیدا ہو جائے۔
پھر اِن نقائص سے کوئی اگر مجھے آگاہ کرے تو مَیں ممنونِ نصیحت کیوں نہ ہوں؟
لیکن، حضرتِ ناصح کی سطحی نظر کی مسلسل لغزش اور آبلہ فریبی کون سمجھائے؟

بے شک، ناول چہ ادبِ اُردو کے لئے ذوقِ فردا کی عکاسی ہے، حالانکہ
پڑھنے پڑھانے والی دُنیا سے اُردو ابھی تک محو تصوّر ہی ہے۔ اِس اعتبار
سے میں خطاوار تھا اور ہوں۔ پہلے اگر نادانستہ تھا تو اب دانستہ ہوں۔

ناول چہ افسانہ و ناول کی روحِ دو آتشہ ہوتے ہوئے تند و تیز ضرور ہو گا۔
شرابِ الصّالحین کے عادی اگر اس جرعۂ تند سے رقص کرنے لگیں تو ظرفِ
بوسیدہ کی شرمناک شکست ہو گی — یا — بادۂ ظرف سنج کی شاندار فتح۔
ناول چہ کی بے باک عکاسی میں، فنِ نقاشی کے محاسن کے علاوہ اور کوئی

مقصد پالینا ایسے دماغ کے بوتے کا روگ نہیں جو علّامہ شبلی کو شاعر اور ڈاکٹر اقبال کو ناصح سمجھتا ہو۔ یا۔ کلامِ غالب میں پیامِ حیات نہ پاتا ہو۔

جدّت، روش اور نقّاشیٔ فردا ہمیشہ رائج الوقت اِستبداد کی ہدفِ ملامت رہی اور رہیگی۔ لیکن محض تقویمِ پارینہ کی محافظ دفتری طبعِ رسا اور استعدادِ خداداد کی کسوٹی نہیں بن سکتی۔

ناول و افسانہ نواز دنیا کی صف آرائی بھی عجیب ہے :-

ایک صف چاہتی ہے کہ ناول بوستانِ خیال نہ ہو، مگر گلستانِ رومان ہو؛

〃 〃 〃 راہ نجات نہ ہو، مگر اخلاقِ جلالی ہو؛

〃 〃 〃 سیاست نہ ہو، مگر قومیّت سے سرشار کر دے؛

〃 〃 〃 لذّتِ عشق نہ ہو، مگر محبّت کا دیوانہ بنا دے؛

〃 〃 〃 ہنسا دے؛

〃 〃 〃 رو، لا دے!

مگر کتنے اصحاب ہیں جو ناول نگار سے دراصل کہتے ہوں کہ "بجا اپنا ترانہ تو + سُنیں سا، تیری صدا کیا ہے؟"

واقعی میں اِس ناول کا نام 'فاحشہ' رکھنا چاہتا تھا مگر چند بے پناہ احباب نے ایسا مجبور کیا کہ 'فاحشہ' کو 'نقش و نقّاش' بنا دینا پڑا۔

اب آپ فیصلہ کریں کہ ترقی ہوئی یا تنزّل؟

کیا یہ تمام تناقضِ آرا محض اُس عینک پر مبنی نہیں جو دیکھنے والی آنکھ پر مسلّط ہو؟ میری اِستدعا صرف اِس قدر ہے کہ آپ اِس ناول سچے کو،

اگر ذوقِ سلیم اور فرصت اجازت دے تو کسی خاص عینک کے بجائے اپنی ہی آنکھوں سے تھوڑی سی توجہ کے ساتھ ملاحظہ کیجیے — پھر — آپ چاہیں تو

نا روا کہیے ، نا سزا کہیے !
کہیے ، کہیے ! مجھے بُرا کہیے ! (غالب)

شیخو پورہ
۱۸ اکتوبر ۴۴ء

علی گڑھ
۷ فروری ۵۴ء

پرانی دہلی میں، کشمیری دروازے کے باہر، ان ڈرہل روڈ پر ایک چھوٹی سی خوش نما کوٹھی میں، مسٹر جگ موہن ناتھ کنزرو تنہا رہتے تھے۔ اُن کے پتا کو چولا بدلے ایک جگ ہو چکا تھا اور اُن کی ماتا کو سورگ باشی ہوئے دس سال گذر گئے تھے۔ وہ بیس سال کی عمر میں، اکلوتے ہونے پر، ماں باپ کی پوری جائداد جس کا بڑا حصّہ چاندنی چوک میں فوّارے کے پاس واقع تھا ہاتھ آجانے سے، مال دار اور خود مختار ہو گئے۔

ابتدا ہی سے ڈرائنگ اُن کو بھاتا تھا اور تصویریں اُن کو اچھی لگتی تھیں۔ بڑھتے بڑھتے وہ خود تصویریں اتارنے لگے اور تعلیم ختم کرتے کرتے انہوں نے کئی مرتبہ اپنی یونیورسٹی سے انعام لئے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر اُن کے والد کا ارادہ تھا کہ آگے چل کر اُن کو یورپ یا امریکا بھیج دیں۔ طالب علم کی حیثیت سے، کنزرو

ذہین اور طبّاع ثابت ہوئے اور اپنے امتحانوں میں ہمیشہ اوّل درجے میں کامیاب ہوتے رہے؛ مگر اس پر بھی وہ اپنے ذاتی میلان کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور عام روش کے مطابق مقابلے کے امتحانوں میں شرکت یا ام پی رپل سروس کا خیال تک اُن کو نہیں آیا۔

تصویریں دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا طبع خداداد پر منحصر ہو، مگر تصویریں اُتارنا، کھینچنا اور بنانا مطالعہ اور محنت کا ثمر ہے۔ کنز رد اِن منزلوں سے پورے لگاؤ کے ساتھ گزرے اور خود مختار ہو کر اِٹلی چلے گئے۔ ڈھائی سال اِٹلی میں، ایک سال انگلستان میں اور ایک سال فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحی میں گذار کر ہندوستان واپس آئے تو کسی طرح آرٹسٹ سے کم نہ تھے۔ چند ہی سال میں وہ ملک کے بہترین نقاشوں میں شمار کئے جانے لگے۔ اُن کی عمر کے دس سال آرٹ سیکھنے اور آرٹسٹ بننے میں گذر گئے۔

کالی اور گوری کوڑیوں صورتوں سے اُن کا واسطہ پڑا اور دور چھوں نظر گیر شکلوں سے سابقہ رہا، مگر شادی کا خیال کبھی بھول کر بھی اُن کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ ۳۵ برس کی عمر میں بھی ویسے ہی تھے جیسے ۲۵ سال کے سن میں۔ نہ تنہائی نے اُن کو چھوڑا، نہ انھوں نے تنہائی کو۔ ہلنا جلنا حیاتِ انسانی کا قلب ہو، مگر کنزرد اس کو صحیح معنوں میں دل ہی سمجھتے تھے۔ دل کی حرکت یا نفس کی آمد و رفت کا احساس مستقل صورت مرض قلب یا تنفس ہی میں ہو سکتا ہے اور کنزرد نہ دل کے مریض تھے نہ دمے

کے، ملنے جلنے والوں سے ملنا جلنا ہوتا رہتا تھا اور اُن کو اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی رُوح رواں آرٹ تھا اور وہ اِسی کی بدولت زندہ تھے۔

اسکول اور کالج کے زمانہ میں، وہ پے درپے کر صرف چار یار پیدا کر سکے، مگر تلاشِ معاش نے اِن چاروں کو تتر بتر کر دیا۔ جب وہ یورپ سے پلٹے تو اُن میں سے ایک بھی دِلی میں نہ تھا۔ نئے ملنے جلنے والوں میں فقط سلیم ایک ایسا نوجوان تھا جس سے کُنز رو کی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اِن کی تصویروں کے بے تکے مدّاح اور ناسمجھ نکتہ چیں تو بہت تھے، مگر "تحسینِ ناشناس" کے گروہ سے یہ محض سلیم کو خارج سمجھتے تھے۔ سلیم کی عمر نے ۲۴ واں سال ہی دیکھا ہو مگر اُس میں آرٹ کے جراثیم فطرتاً موجود تھے۔ وہ پیٹ پالنے سے مجبور ہو کر کُنز رو کی طرح اپنی زندگی آرٹ کے لئے وقف نہ کر سکا لیکن اِس کی چیٹک اُس سے نہ چھوٹی تھی نہ چھوٹی۔ وہ دِہلی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور فرصت کے تمام اَوقات کُنز رو کے ساتھ گذارتا تھا۔ دراصل وہ کُنز رو کا مدّاح ہی نہیں خوشہ چین تھا اور کُنز رو سے تبادلۂ خیالات اُس کے لئے بہت کچھ سبق آموز تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سلیم بھی ابھی تک شادی کے جنجال سے ناآشنا تھا اور زیادہ اس لئے کہ وہ بھی تشنۂ فن تھا کُنز رو کو اُس کی صحبت میں لطف اور اُس کی بات چیت میں مزہ آتا تھا۔

سلیم کے علاوہ، کُنز رو کی خلوت میں اگر کسی اور کو دخل تھا تو وہ مشتری تھی۔ مشتری کا حسب و نسب صرف بُرجِ حمل یا اُس کی ماں کے پیٹ تک

محدود تھا۔ نہ حسن کی دیپ و مینس کے باپ کا وجود، نہ اُس کے باپ کا علم!
وہ اعلانِ خودی کے لئے اپنی مردہ ماں کی تقلید میں کوٹھے پر نہ بیٹھی ہو، مگر
اِسکرین کے ذریعے بامِ شہرت پر ضرور چڑھ گئی۔ بلندی سے نظر آنے والی
چیز بلند ہی نظر آتی ہے بلکہ اکثر اُس کے دیکھنے میں دیکھنے والے کی ٹوپی نہ بھی
گرتی ہو تو آگا پیچھا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ وہ پردے پر جلت پھرت دکھا کر
سینکڑوں کو روزانہ اندھا کرتی رہتی۔ اُس کی زندگی کے نظر گیر زمانے کا بڑا
حصہ چوپاٹی اور اپالو بندر پر گذرا ہو، مگر چاوڑی بازار اُس کی ماں کا وطن تھا۔
دِلی آ کر اُسے کنزرو کی شہرت کا علم ہوا اور پایۂدار سے تاپائیدار کو اپنی طرف
کھینچ لیا۔ اِن دونوں کا آمنا سامنا ہوا مگر وہ کنزرو کو اپنی طرف متوجہ نہ
کر سکی۔ آخر اُس نے اپنی تصویر ایک معقول رقم کے معاوضے پر کنزرو
سے بنوائی اور ذاتی ملاقات کی یہ تقریب کام آ گئی۔ اس قدِ آدم تصویر کے
لئے مشتری کو دو مہینے کنزرو کے اِسٹوڈیو میں گھنٹوں تنہا بیٹھنا پڑا اور یہ
آغاز دیرپا انجام بن گیا۔ اس طرح مشتری کنزرو کا موجودہ مادر زاد
مَوڈِل بن گئی۔

یہ تعلق کم و بیش ایک سال کا ہو چکا تھا مگر کنزرو مشتری میں نہ ڈوبے
نہ ڈوب سکتے تھے۔ وہ مشتری کو نہایت عمدہ مَوڈل کی طرح اپنے سَر
اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے، اُس کے مختلف انداز اپنی کاٹ چھانٹ
کے ساتھ کپڑے کی سطح پر اتارتے تھے، اُس کی بہت کچھ خاطر اور قدر
کرتے تھے، مگر اِس سے زیادہ اثر اُن کے دل و دِماغ پر نہ ہونے والا تھا

نہ ہوا۔ لیکن مشتری ان کی صحبت میں لگاؤ کا مزہ پا لی تھی، ان کے آرٹ کی دل دادہ ہو کر ان پر جان دینے لگی تھی اور ان کے بغیر اس کی زندگی کی جان ہی نکل جاتی تھی۔ وہ اپنے جذبات کا جذباتی جواب نہ پاتی ہو، دل سے نکلنے والی آہ کے بدلے میں دماغ سے پیدا ہونے والی واہ دیکھتی ہو، مگر پھر بھی وہ مایوس نہ تھی۔ مایوس نہ ہونے کی وجہ کنز رد کے دل و دماغ کا قطعی خالی ہونا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کنز رو نے اس کے برابر کسی اور کی قدر بھی نہیں کی، توجہ اور لگاؤ ہونے کا تو ذکر ہی کیا؟ رقابت کا قدم درمیان نہ ہونے پر آس کا سانس تک باقی رہنا لازمی تھا۔ سلیم بھی اس نئے رنگ کا مطالعہ کرتا تھا اور لطف لیتا تھا۔

سلیم کو یقین تھا کہ مشتری کی آس ایک نہ ایک دن ٹوٹنے والی تھی اور وہ دن شاید مشتری کی زندگی کا آخری دن ہو۔ لیکن یہ یقین اس نے مشتری پر کبھی اشارے کنائے میں بھی ظاہر نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے اظہار کے معنے مشتری کی قبل از وقت موت یا زندہ درگور ہونا ہو سکتے ہیں۔ وہ کنز رد کو مشتری کی بابت کبھی کبھار ٹٹولتا تو جذبۂ محبت کے متعلق اچھی خاصی بحث ہو جاتی۔ سلیم آرٹ کے بابت کنز رو کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتا ہو، مگر محبت کا نظریہ ایک جدا گانہ چیز تھی۔ یہ تو نہیں کہ کنز رو جذبۂ محبت کا منکر ہو، مگر اس کا نظریۂ محبت سلیم کے فہم سے بالاتر تھا۔ سلیم اس کو اس جذبۂ شریف سے ناآشنا اور دیوتائے عشق کا کافر نہیں تو منافق ضرور سمجھتا تھا۔

کشزر کا نظریہ تھا کہ آرٹسٹ کو آرٹ کے سوا کسی اور سے محبت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اپنے مفروضہ حسن سے ملتی جلتی پیکرِ انسانی سے دوچار ہونے پر آرٹسٹ محبت سے سرشار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ خاص صورت اپنی ذات سے قابلِ پرستش ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے مفروضہ کمالِ آرٹ کی بہت کچھ جھلک اس میں پاتا ہے۔

اس وارفتگی کا دارومدار صرف کمالِ آرٹ کی مماثلت پر مبنی ہے، شخصیت پر نہیں۔ جب اس مماثلت میں انحطاط یا تغیر ہو جائے تو وارفتگی کا قیام ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری پیکر پہلی سے زیادہ کمالِ آرٹ کے مطابق مل جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ آرٹسٹ پہلی سے کنارہ کر کے دوسری پیکر کی پرستش نہ کرنے لگے۔ آرٹسٹ کی محبت ذات سے نہیں ہوتی، آرٹ سے ہوتی ہے۔ وہ کائنات کے ہر برگ و بار میں، گرد و غبار میں، انسان و حیوان میں، اسی آرٹ کو تلاش کرتا ہے، محسوس کرتا ہے اور طرح طرح سے ظاہر کرتا ہے۔ مجرد آرٹ اس کی نظر میں ہر وقت نظر آتا ہے۔

سلیم کی رائے یہ تھی کہ محبت اور آرٹ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ محبت کا انحصار نہ آرٹ پر ہے، نہ حسن پر۔ یہ کسی نمونے کی خوبی یا ظاہری صورت کی موزونیت سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے وجوہات عالم کی نیرنگی کی طرح بے شمار اور غیر محدود ہیں۔ کسی چیز یا فن میں ڈوب

جانا محبّت نہیں، اِنہماک ہے۔ محبّت کے لیے ہمیشہ اِنہماک کی حد تک پہنچنا لازمی نہیں۔ خلوص البتہ محبّت کی بنیاد نظر آتا ہے مگر بعض اوقات نفرت بھی محبّت پیدا کر دیتی ہے۔ نہ محبّت سے آرٹ پیدا ہو سکتا ہے، نہ آرٹ سے محبّت۔ محبّت کی آگ "لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے"؛ نہ آرٹ کو محبّت سے واسطہ نہ محبّت کو آرٹ سے۔ محبّت ارادی جذبہ نہیں۔ پیدا ہو جانے پر یہ تمام جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔

کنزرو کہتے تھے کہ آرٹسٹ کے نظریۂ محبّت کو آرٹسٹ ہی سمجھ سکتا ہے۔ عام لوگ آرٹسٹ کو بے وفا، فریبی اور دغاباز سمجھنے میں اپنے چھچھورے پن، اوچھے پن اور اتھلے پن کا اِظہار کرتے ہیں: وہ آرٹ کی گہرائی تک غوطہ لگائیں تو ڈوب جائیں۔ مگر سلیم کا خیال تھا کہ آرٹسٹ جذبۂ محبّت سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ موزونیت کا معتقد ہونے پر، وہ جب کبھی صنعت کے نمونۂ موزوں سے غیر معمولی طور پر اثر پذیر ہوتا ہے تو اُس کو محبّت سمجھ لیتا ہے۔ یہ غلط فہمی اِرادی نہیں فطری ہوتی ہے۔ آرٹسٹ دراصل خود جو، خود نما اور خود پرست ہوتا ہے۔

کنزرو اور سلیم کے اِختلافِ معتقدات سے ان دونوں میں غیریّت کے بجائے رغبتِ باہمی پیدا ہوتی تھی۔ بے باک اظہارِ خیال صحبت کو بے تکلّف اور دلچسپ بنا دیتا تھا۔ مگر آرٹ کے میدان میں سلیم کنزرو کا حرف بہ حرف پیرو تھا۔ کنزرو سلیم کی تصاویر میں نقص نکالتا اور اصلاح کرتا، اور یہ بلا چون و چرا اُس کو تسلیم کرتا اور ہدایات پر عمل کرتا، مگر محبّت کے معاملے

میں کُنزرو نے سلیم کی کبھی نہیں مانی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آرٹ کا تمام دارمدار مذاق انفرادی پر مبنی ہونے والے مُسلّمات پر ہے اور مُحبّت کا عمل کسی شئے پر بھی نہیں ہے یا شاید کُنزرو کا رنگ دس سال کی بزرگی کا نتیجہ ہو، جس کی بناء پر ایک سِن رسیدہ لاجواب ہوکر بھی "دنیا دیکھو ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟" کی آڑ میں ایک نوجوان کو مات کر دینا چاہتا ہے۔ واقعی یہ تجربے اور ہٹ دھرمی کا آخری وار اکثر استعمال کیا جاتا ہے اور ہر دفعہ نہ دُھرا جائے نہ اُٹھایا جائے ثابت ہوتا ہے۔ زندگی بدلتی رہتی ہے، سماج بدلتا رہتا ہے، دُنیا بدلتی رہتی ہے مگر ایک بیس تیس سال آگے بڑھ جانے والا پیچھے ہی دیکھتا رہتا ہے اور اُس کو اپنی ہی دُنیا نظر آیا کرتی ہے۔ اِس کو یک رنگی کی خودی کہا جائے یا بدرنگی کی بے خودی؟

ستمبر ۱۹۴۱ء میں شب برات کے دو دن بعد، شام کے ۵ بجے، کُنزرو کے کھانے والے کمرے میں، اُن کے ساتھ سلیم بھی چائے پیتے اور بات چیت کرنے میں وقت گذار رہا تھا۔ چھوٹی سی میز کے چاروں طرف صرف چار کُرسیاں لگی تھیں، اور پہلو کی دیوار سے ملی ہوئی ساگون کی الماری کھڑی تھی جس کے نیچے کے حصّے میں غالباً برتن بند تھے اور درمیانی کُھلے ہوئے درجے میں چائے اور کافی کے نُقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ سب سے اُوپر والے درجے میں، ایک صاف شفّاف آئینے کے سامنے اور پہلو میں تختے پر سیب اور رنگترے رکھے تھے۔ کمرے کی حالت کے علاوہ، کُنزرو کے لباس سے بھی اُس کی نفاست کا پتہ چلتا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرٹسٹ کی سی بناوٹی لباس وغیرہ سے بے پروائی پیدا کرنے کا قائل نہ تھا۔ اُس کے چہرے سے بھی اُسترے کی روزانہ جاروب کشی نمایاں تھی۔ کاشمیری رنگ و روپ کے ساتھ اُس کا جسم اُبھرا اور قد درمیانہ تھا۔ بال سیاہ اور اوپر کی طرف بلا مانگ نکالے کنگھا کیے ہوئے تھے۔ آنکھیں گول، پُتلیاں بھوری، ناک کھڑی ہوئی اور دہانہ چھوٹا تھا۔ نتھنے پھیلے ہوئے اور ہونٹ باریک تھے۔ اُس کی پیشانی پر اُلٹی بھوں سے اوپر سے سر کے بالوں کی حد تک ایک رگ نمایاں تھی جو نیچے کے رُخ دو شاخہ ہو کر جلد کے اندر غائب ہو جاتی تھی۔ اُس کے سیدھے ہاتھ کی طرف سلیم تھا جس کا قد لمبا، بدن گداز اور رنگ گورا تھا۔ اُس کے بالوں میں ہلکی سی لہر تھی اور مانگ آڑی تھی، آنکھیں بادامی، پُتلیاں سیاہ، ناک ستواں ہونے کے قریب اور دہانہ بڑا تھا۔ ہونٹ درمیان سے کھلے رہنے اور صاف چمکتی ہوئی بتیسی دکھاتے رہنے کے عادی تھے۔ بال کے وبال سے اِس کا چہرہ بھی صاف تھا۔ دونوں کی ہاتھوں کی انگلیاں سُبک اور لمبی تھیں، مگر کُنزرو کی نوک دار مخروطی بھی تھیں۔ یہ چائے کی ایک ایک پیالی پی چکے تھے اور اب دوسری کا نمبر تھا۔ کُنزرو ایک رنگترہ چھیلتے جاتے تھے اور سلیم کش مش ٹونگ رہے تھے۔

کُنزرو: میں تمہاری تصویر کل دیکھ سکا۔ اس سے پہلے مجھے خیال نہیں آیا۔
سلیم: آپ کی رائے کیا ہے؟

کنسٹرڈو: "تمہارا تصویر نہایت عمدہ۔ مگر اس میں وہی کمی ہے جو میں اکثر بتا چکا ہوں۔"

سلیم: "یعنی زندہ موڈل کا نہ ہونا؟"

"ہاں! اس عیب کو آرٹسٹ کے سوائے دوسری آنکھ نہیں پا سکتی؟"

"واقعی آپ کے سوائے اوروں کو یہ بات نظر کبھی نہیں آتی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے سامنے کوئی زندہ موڈل نہیں۔"

"میں ہی نہیں، ہر آرٹسٹ اس عیب کو پکڑ لے گا۔ تمہاری تصویریں صاف بتاتی ہیں کہ تم مشہور پینٹرز کے ماسٹر پیسز سے اپنا موڈل بناتے ہو۔ اُن کے توڑ کو اپنے انداز میں ڈھالتے ہو۔"

"ہمیشہ تو نہیں، مگر اکثر ایسا ضرور کرتا ہوں۔"

"بعض دفعہ ماسٹر پیسز کے علاوہ فوٹو کی تصویروں میں سے کسی کو پسند کر کے اِن لارج کرنے میں اپنا تصور استعمال کرتے ہو۔ آج کل نیوڈزم کے بدولت ایسی تصویروں کے کئی رسالے نکلتے ہیں۔"

"بعض دفعہ ایسا بھی کیا ہے۔ مگر اس میں ہرج کیا ہے؟"

"ہرج نہیں، مشق کے لیے یہ طریقہ ضروری ہے۔ مگر تم

اُس درجے سے گذر چکے۔ تم اب مشق سے اُونچے ہو۔ اِس کا جاری رکھنا تو ہمیشہ لازمی ہے مگر سیکھنے کی مشق اور سیکھ چکنے کے بعد کی مشق میں بُہت فرق ہے۔ سیکھنے کی مشق نقّالی ہے اور سیکھ چکنے کی خیالی۔ اب تم خیالی میدان میں داخل ہو چکے ہو تمہاری مشق بھی تصوّر کی بُنیاد پر ہونی چاہیئے۔"

(چائے کا ایک گھونٹ لے کر) "تصوّر تصویروں کی مُطالعے سے پیدا ہوتا ہے"

"قطعی نہیں۔ تصویروں کے مُطالعے سے تُم اُس مُصوّر کے تصوّر کو سمجھتے ہو۔ تمہارے اپنے تصوّر کو اِس میں دخل نہیں ہوتا۔ اُن تصویروں کا تصوّر وہ مُصوّر پیدا کر چُکا۔ تم اُن کے مطالعے سے کوئی تصوّر پیدا نہیں کر سکتے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

"اپنا ذاتی تصوّر زندہ موڈل کے مُطالعے سے پیدا کرنا چاہئے۔"

"آپ مطالعے کو زندہ موڈل تک ہی محدود کیوں کرتے ہیں؟ مُطالعہ فطرت مناظر اور آبشاروں میں بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کیا معنی ہوتا ہے"، کنّنر دسنے ہاتھ میں اکٹھے ہو جانے والے چھلکوں کو خالی تشتری میں ڈالتے ہوئے کہا "آبشار، کوہسار، جنگل، آبادی، یہ سب نیچر کے جیتے جاگتے موڈل نہیں تو اور کیا ہیں؟"

"تو پھر ان کا ہی مطالعہ کیوں نہ کیا جائے؟"
"بے شک لینڈ سکیپ پینٹر کے لئے اِن ہی کا مطالعہ کافی اور لازمی ہے۔"
"آپ مناظر کی نقاشی کو انسانی جسم کی مصوری سے کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟"
"اِس لئے کہ یہ مناظر اِنسان سے کمتر ہیں۔ اِنسان بہترین نمونۂ آرٹ ہے۔"
"مگر یہ مناظر اِنسان کے مطالعے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"
"بے شک۔ لیکن خود اِنسان سب سے بڑا مطالعہ ہے۔ دور دیکھنے والوں کی قریب کی نظر اکثر کمزور ہوتی ہے۔ اگر انسان کو نیچر کے آرٹسٹ کا بہترین نمونہ مطالعے کے لئے مل سکتا ہو تو اُس سے کم درجے کی صنعت پر توجہ کرنا گھٹیا کام ہوگا۔"
"پہلے گھٹیا چیز پر عبور حاصل کر لوں، پھر بڑھیا پر آجاؤں گا۔"
"ہرگز نہیں۔ اوّل تو تمھاری تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ تم پورٹ ریٹ کی مصوری کا مادّہ رکھتے ہو۔ لینڈ سکیپ سے تم کو پیدائشی مناسبت نہیں۔ دوسرے مناظر کی نقاشی میں عرصے تک مبتلا رہنے کے بعد انسانی جسم کی مصوری اختیار کرنا آسان نہیں، بلکہ محال ہے۔ گاؤں کا رہنے والا شہر کی آبادی میں خوش نہیں رہ سکتا، اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ شہری تمدّن اور سماج کی دلچسپی اور نظر فریبی نہ سمجھ سکتا ہے، نہ محسوس کر سکتا ہے۔ شیش محل یا بانکے

کتے کی طرح چند روز چاروں طرف دوڑتا اور گھومتا پھرتا ہے مگر
اس کے بعد گھبرانے لگتا ہے۔"
"پھر شہری لوگ گاؤں کی زندگی کیوں پسند کرتے ہیں اور جب
موقعہ ہاتھ آئے شہر سے باہر بھاگنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟"
"محض اس لئے جس لئے طالب علم شام کو کھیلنا پسند کرتا ہے۔
شہری کو گاؤں میں آباد کیا جائے تو پاگل ہو جائے۔ اس کے
علاوہ ذکر تو آرٹسٹ کا ہے، عام آدمیوں سے کیا مطلب؟ طالب
علموں میں بھی، جو در اصل علم کا طالب ہوتا ہے، کھیل میں لطف
نہیں پاتا؛ صحت قائم رکھنے کے لئے شام کو ہاتھ پاؤں ہلا لیتا ہو تو
دوسری بات ہے۔ لوگ اس کو کتاب کا کیڑا کہیں مگر اس کو کتاب
چاٹنے ہی میں مزہ آتا ہے۔"
دبقیہ چائے پی کر پیالی تشتری میں رکھتے ہوئے، "آرٹسٹ
بھی شہری آبادی چھوڑ کر جنگل اور پہاڑیوں میں وقت گذارنا پسند
کرتا ہے۔"
"لینڈ سکیپ والا آرٹسٹ۔"
"نہیں، پورٹ ریٹ والا بھی۔"
دچائے کا ایک گھونٹ لے کر" پورٹ ریٹ والا اگر ایسا کرتا ہے تو صرف
دو وجوہات سے۔ یا تو وہ شہر میں تنہائی اور یکسوئی نہیں پاتا
اور یا وہ اپنے موڈل کو صحرا و کوہ ساریں دیکھنا چاہتا ہے۔"

"یہ کیوں۔ اُس کو اپنے موڈل کے مُطالعے سے مطلب ہے۔ فطرت کے مناظر کی کیا ضرورت ہے؟"

"اپنے موڈل کے مُطالعے کے لئے۔" اپنی اور سلیم کی پیالیوں میں چائے ڈال کر کنز روئے کہا "وہ مناظر کا مُطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ موڈل کو مختلف مناظر میں مُختلف فرحت ہوتی ہے اور نقّاش اِنبساط کی مختلف کیفیتوں یا درجوں کا مُطالعہ کر سکتا ہے۔"

(تھوڑا سا دُودھ وہ اپنی پیالی میں ڈال کر دُودھ دان رکھتے ہوئے)

"تمام نقّاشوں نے مُطالعۂ فطرت ہی کا سبق دیا ہے۔"

"اول تو مُطالعۂ فطرت کے لئے خُدا انسان بہترین مطالعہ ہو۔ دوسرے کائنات کے مناظر کا مُطالعہ نقّاش کی الف بے تے ہے۔ تم اَبجد خواں نہیں۔ تم کو اِس کی حاجت نہیں۔"

"گویا نقّاش کے مُطالعے کا اِنحصار اِنسان پر ہے؟"

"بے شک۔ اِس میں کلام ہی کیا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں آرٹ کا اِنحصار اِنسان پر ہے، کائنات کا اِنحصار اِنسان پر ہے، بلکہ خُدا کا انحصار اِنسان پر ہے۔"

"اب تو آپ تصوّف یا ویدانت پر چلے گئے۔ ذکر تو آرٹ کا ہو۔"

"لیکن تصوّف یا ویدانت آرٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ آرٹسٹ جس آرٹ کو دُوسرے میں تلاش کرتا ہے، صُوفی یا یوگی اپنے میں تلاش کرتا ہے۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ صُوفی یا یوگی حد درجے کا کنجوس

ہوتا ہے اور آرٹسٹ اوّل درجے کا سخی ۔"

"یعنی؟"

"یعنی صُوفی اور یوگی اپنے فن کو ۔ ۔ ۔ ۔"

"علم کہیے!"

"اچھا علم سہی ؛ صُوفی اور یوگی اپنے علم کو طرح طرح سے چھپاتے ہیں اور آرٹسٹ اپنے آرٹ کو طرح طرح سے ظاہر کرتا ہے ۔ وُہ جو کچھ دیکھتے ہیں بتاتے نہیں ، مگر یہ جو کچھ دیکھتا ہے اور اس کو بھی دکھاتا ہے ۔"

"یہ اعتراض صحیح نہیں ۔ مولانا رُوم کی مثنوی شاید آپ نے نہ پڑھی ہو مگر گیتا تو پڑھی ہو گی ۔"

"میں نے دونوں پڑھی ہیں اور توجہ کے ساتھ پڑھی ہیں"

"پھر آپ کس طرح کہتے ہیں کہ صُوفی بتاتا نہیں ۔ مولانا روم نے تو سب کچھ واضح کر دیا ہے ۔"

"مثنوی ہو یا گیتا ۔ دونوں اس قدر بتاتی ہیں کہ حقیقت صرف ایک ہے ۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں بتاتیں ۔ زیادہ سے زیادہ تصوّف کی تشریح کرتی ہوں ، تصوّف کا ذوق پیدا کرتی ہوں ، تصوف کا فن بتاتی ہوں مگر آرٹ نہیں بتاتیں ۔"

"آرٹسٹ بھی اپنا فن ہی بتاتا ہے آرٹ تو نہیں بتاتا ؟"

"وہ اپنا آرٹ دکھاتا تو ہے ۔"

"صُوفی بھی اپنا آرٹ دکھاتا ہے ؛ دیکھنے والا چاہیے ۔"

"یہ تو باطنیہ فرقے کا طلسم آ گیا۔"

"اگر آرٹ ہی باطنی ہو تو ظاہر سے کیا تعلق؟"

"اچھا تصوف اور آرٹ کے مقابلے کو چھوڑو، اتنا تو مانو گے کہ تصوف بھی زندہ موڈل پر منحصر ہے۔"

"اگر اپنے نفس کو سمجھنا موڈل کا مطالعہ ہے تو واقعی تصوف بھی موڈل پر منحصر ہے ورنہ نہیں۔ اس کو تو فنا سے تعلق ہے۔ پہلا درجہ اپنے مرشد یا شیخ میں فنا ہونا، پھر رسول میں فنا ہونا اور آخر میں اللہ میں فنا ہونا۔"

"لیکن شیخ، رسول اور اللہ، موڈل نہیں تو اور کیا ہیں؟ شیخ کے زندہ موڈل ہونے میں حجت ہی نہیں ہو سکتی اور رسول بھی ایک خاص موڈل کا تصور ہے۔"

"اللہ تو کسی خاص موڈل کا تصور نہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں کہ اللہ کا تصور کس طرح کیا جاتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہاں خود اپنے آپ کو اپنا موڈل بنایا جاتا ہوگا"

"یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب + تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ آرٹسٹ ہوتا" سلیم نے مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔

"ارے بھئی توبہ کرو۔ غالب کی روح ہر وقت دلی میں منڈلاتی رہتی ہے۔"

"دلی کیسی؟ اس ظالم کی روح تو تمام اردو سمجھنے والی دنیا پر چھائی

ہوئی ہے۔"

"وہ بھی شاعری کا موڈل تھا...."

"شاعری کا یا شاعر کا؟"

"جو کچھ بھی سمجھو۔"

"نہیں آپ نے صحیح کہا۔ غالب شاعری کا موڈل تھا۔ بابر عزم و شجاعت کا موڈل تھا، تیمور قتل و غارت کا موڈل تھا۔"

"دنیا والوں کو چھوڑ کر دین کا میدان لو تو وہاں بھی بغیر موڈل کے کام نہیں چلتا۔ اوتار ہوں یا نبی ہر مذہب اپنے سامنے ایک موڈل رکھتا ہے۔"

"بے شک۔ زندگی کے ہر میدان میں ہادی چاہیئے اور آرٹسٹ اسی کو موڈل بنائے گا۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کائنات کے آرٹسٹ نے ہر میدان میں ہادی پیدا کر کے خود زندہ موڈل کے مطالعے کا سبق دیا ہے۔ پھر تم کو موڈل سے کیوں نفرت ہے؟"

"نفرت ہرگز نہیں ہے، البتہ یہ میرے بوتے کا روگ نہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے آپ جیسی فراغت ہے نہ میرے پاس اتنے ٹکے ہیں کہ مس مورتی جیسا موڈل بہم پہنچا لوں۔"

"اس میں ٹکوں کی حاجت نہیں تلاش کی ضرورت ہے۔ مس مورتی کا ہاتھ آجانا محض اتفاق ہے۔ میں نے اس کو نہ تلاش کیا، نہ اس کی تلاش

میں ایک ادھی اٹھائی۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے مگر بل جانے کے بعد یا بند بنانے کے لئے تو کافی رقم اٹھانی پڑتی ہو گی۔"

"تعجب ہے کہ تم بھی اوروں کی طرح غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میں نے نہ اس کو اپنا پابند کیا نہ اس لئے ایک حبہ اٹھاتا ہوں۔"

"کیا آپ نے اس کو آج تک کچھ نہیں دیا؟"

"تنخواہ کی طرح کچھ نہیں دیا......"

"تنخواہ کے نام سے نہ سہی انعام کے طور پر، تحفے کے رنگ میں۔ حاصل کسی طرح ہو غرض ہے تو آپ سے۔"

"سن تو لو کہ میں نے آج تک کتنا دیا، پھر رائے لگانا۔"

"فرمایئے؟"

"اپنی تصویر بنوا چکنے کے بعد سے اس کو میرا موڈل بنتے ہوئے اپریل میں سال بھر ہو جائے گا۔ اس مدت میں میں نے صرف دو تصویریں بنائیں اور ہر تصویر کے مکمل ہونے پر اس کو فقط دو سو روپے دئے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟"

"میں سچ کہتا ہوں اس سے کوڑی زیادہ نہیں دی؛ گویا جس قدر رقم میں نے اس کی تصویر بنانے میں لی ابھی تک اس کی ادھواڑ بھی اسے نہیں دی۔"

"دنیا تو یہ سمجھتی ہے کہ آپ اس پر ایک ہزار ماہوار اٹھاتے ہوں گے۔"

"دنیا کچھ بھی سمجھے مگر حقیقت یہ ہے"

"آپ اس معاملے میں بڑے خوش قسمت ہیں۔"

"واقعی ہوں۔"

"مگر میں آپ کی سی قسمت کہاں سے لاؤں۔"

"قسمت وسمت کو تو رہنے دو۔ تلاش سے خدا بھی مل جاتا ہے۔"

"مل بھی جائے تو اُسے اپنا کس طرح بناؤں۔ نہ آپ سا آرٹ۔ نہ آپ سا ماحول۔ پھر کوئی میرے ہاتھ کیوں لگے؟"

"مگر مجھ سے بہتر صورت شکل اور مجھ سے کم عمر۔ عین شباب کا سن۔ یہ تو اچھے اچھوں کے رجھنے کے لئے کافی ہے۔"

"شکریہ۔ اِس عمر میں ایک تو قدر دان ملا۔"

"مذاق برطرف۔ میں آرٹسٹ کی آنکھیں رکھتا ہوں۔"

"تو پھر یہ بتائیے کہ تلاش کہاں کروں؟ میں تو آج تک ایک بھی ایسی صورت سے دوچار نہیں ہوا جو مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی۔"

"یہی بات تو بتاتی ہے کہ تم بھی آرٹسٹ کا دل و دماغ رکھتے ہو، عام صورتیں تم کو متوجہ نہیں کرسکتیں۔"

"یہ اور بھی مصیبت ہے۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ لڑکی کے بجائے لڑکے کو موڈل کیوں نہ بناؤں۔"

"کوئی مضایقہ نہیں۔ شرط یہ ہے کہ تم اُس لڑکے سے ایسے ہی متاثر ہو جیسے لڑکی سے ہوتے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میرا مذاق خلافِ فطرت نہیں۔"
"خلافِ فطرت سے آرٹسٹ کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"
"معاف کیجئے۔ میں اِس کا قائل نہیں۔ اِظہارِ پاک بازی و ذوقِ نظر غلط!"
"قطعی غلط سمجھے۔ پاک بازی کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مُحبت ہو، میں محبت کو ضروری نہیں مانتا۔"
"تو پھر آرٹسٹ کے ذاتی لگاؤ سے پیدا ہونے والا اثر تصویر میں نہیں ہوگا۔"
"بے شک نہیں ہوگا: اُس کا ہر تصویر میں ہونا لازمی بھی نہیں۔ میرا مطلب تو صرف اِس قدر ہے کہ تُم اُس لڑکے کو پیکر و رنگ کے لحاظ سے اپنے مذاق کے مطابق غیر معمولی سمجھتے ہو۔"
"اس کے بغیر تو میں اِنتخاب ہی نہیں کرسکتا۔"
"اور اِسی قدر کافی ہے۔ تُمھارے مذاق اور پسند کا اثر تصویر پہ نُمایاں ہوجائے گا۔"
"اُس کی تصویر بھی عریاں ہو؟"
"بے شک۔ عریانی کے بغیر فطرت کا آرٹ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ لباس تو نقص کے ساتھ خوبی کو بھی چھپا دیتا ہے۔"
"چہرہ اور گردن تو کھلی ہوئی ہوگی۔"
"اگر چہرہ اور گردن دکھانا ہے تو باقی جسم ہی کیوں دکھائے؟ لباس سے ڈھکا ہوا جسم آرٹ کے لحاظ سے ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر جب تک پُورا جسم نہ ہو،

میری رائے میں، نمونۂ فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ لڑکے کا جسم پچھلے رُخ سے دِکھانا بہتر ہوگا۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ مرد و عورت کے پچھائے میں کوئی فرق نہیں۔ صرف سامنا ہے جس سے جنسی فرق پیدا ہوتا ہے۔"

"مجھے اِس سے اِتفاق نہیں۔ پُشت کی وضع، کمر اور کولہوں کا تناسب، رانیں اور پنڈلیاں، مرد و عورت کی یکساں نہیں ہوتیں۔"

"یوں تو مرد و عورت کی تمام ساخت جُداگانہ معلوم ہوتی ہے؛ مرد کی ساخت گانٹھ دار۔ اور عورت کی گُداز۔ مگر میرا مطلب صرف نمایاں اور سطحی فرق سے تھا، اسی لئے میں نے پچھایا بتایا۔"

"لیکن مردانہ سینے کی کشادگی، مونڈھوں کا اُبھار، بغل بچوں اور پیٹ کی مچھلیاں دِکھانی مقصود ہوں تو؟"

"تو بے شک سامنا ہی دکھانا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے لڑکے کی بجائے جوان اور تندرست پٹھا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں، مگر بی تناں نے ایک تصویر میں لڑکے ہی کا سامنا لیا ہے۔"

"وہ لڑکا نہیں غالباً پانچ یا چھ برس کا بچہ ہے۔ اس عمر تک سوائے ایک پیدائشی علامت کے بچے اور بچی کی جسمانی ساخت میں کوئی اور فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اُس تصویر سے مردانہ سینے کی کشادگی اور مونڈھوں کی مخصوص ساخت

کا اُس عمر تک بہت کچھ یکساں رہنا دکھاتا ہے۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ باوجود ظاہری یکسانی کے مرد و عورت کی ساخت کا بنیادی اختلاف اُسی عمر سے دکھانا چاہتا ہے۔"

"نقاش کی یہی چوٹی کی خوبی ہے کہ میں اور سمجھتا ہوں اور تم اور۔ نہ مجھے غلط کہا جا سکتا ہے، نہ تم کو۔"

"واقعہ یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت، جسم اور ساخت کی خوبیاں، یا نظرگیر موزونی، زیادہ تر سامنے کے رُخ پر ہی منحصر معلوم ہوتی ہے۔"

"میں بھی یہ سمجھتا ہوں؛ مگر چھپانے کو ترجیح دینے والا گروہ بھی ہے جو نقاشی کے لئے اکثر چھپانے ہی کو لیتا ہے۔"

"ہوگا - اُس گروہ کا مذاق خلافِ فطرت سمجھنا چاہیے۔"

"یہ کیوں؟ - اگایا ہو یا چھپایا دونوں فطری ہیں - مجھے اور تمھیں اس گروہ سے اتفاق نہ ہو مگر اُس کو خلافِ فطرت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اکثر نقاد بھی اُس گروہ کو اس وجہ سے پسند کرتے ہیں کہ وہ عریانی قابلِ اعتراض حدود تک نہیں لے جاتا۔"

"ایسے ہی کم نظر شاعری و ادب میں بھی قابلِ اعتراض عریانی اور زیبندہ عریانی کی حدود قائم کرتے ہیں اور ان دونوں کی حدِ فاصل یا تو اُن کی ذاتی بدنظری نمایاں کرتی ہے یا آرٹ میں اخلاقیات کا ناجائز پیوند دکھاتی ہے۔"

"بالکل صحیح - یہ لوگ آرٹ کے صحیح مذاق سے کورے ہوتے ہیں۔ اُن کی رائے میں عورت کے جسم کا بہت بڑا حصہ نہ دیکھنے کے قابل ہے نہ

دِکھانے کے ۔ بلکہ اُس حِصّے کا حُسن تصویر میں دِکھاتا' یا اُس حُسن سے پیدا ہونے والے فطری جذبات کو الفاظ میں ظاہر کرنا مخرّبِ اخلاق اور پرلے درجے کا گناہ ہے ۔ میں سمجھتا ہوں اِسی قسم کے گروہ نے' بگڑتے بگڑتے ' عورت کے لیے گھونگٹ اور پردہ نکال کھڑا کیا ۔"

"اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں آرٹ کے دشمن بہت زیادہ ہیں اور آرٹسٹ کو ماڈل مِلنا مُحال ہے ۔"

"ماڈل نہ تلاش کر سکنا تمہاری اپنی کاہلی ہے ۔"

"آپ ہی کوئی راستہ بتائیے ؟"

"اچھا تو میرے ساتھ چِتّر کوٹ چلو ....."

"کیا آپ جانے والے ہیں ؟"

"ہاں ! اگلے ہفتہ میں ۔"

"مگر مجھے کون گھسنے دیگا ۔ وہ تو تیرتھ کا مُقام ہے اور میں مُسلمان ہونے کی وجہ سے مَلیچھ ہوں ...."

"ملیچھ نہیں ملکش !" کنزر دو نے مُسکراتے ہوئے صحیح لفظ بتایا "لیکن میں پوہتر جو موجود ہونگا ۔ میرے ساتھ چلو ۔"

"آپ مجھے ہر مقام کی سیر کرا دیں گے ؟"

"کیوں نہیں کرا دونگا ؟ ۔ میں ہر مسجد میں جا سکتا ہوں تو تم ہر مندر میں کیوں نہ جاؤ ؟"

"ہونا تو یہ ہی چاہیئے مگر ایسا ہوتا تو نہیں ...."

ایک نوکر کے اندر آنے اور بلا توقّف اپنا بم مار دینے سے سلیم کا جُملہ نا تمام رہ گیا۔

"سرکار! مُورتی دیوی آ گئی ہیں اور گول کمرے میں ہیں" مُلازم نے اِطّلاع کی۔

"اچھا آتا ہوں" کنور رو نے جواب دیا اور سلیم سے کہا "تُم بھی چلو! ایک نئی بات پیدا ہوئی ہے۔"

"کیا؟"

"بمبئی ٹاکیز والے مُورتی کو ایک نئی تصویر کے لئے بُلانا چاہتے ہیں اور وہ اِنکار کر رہی ہے۔"

"دام کم دیتے ہوں گے؟"

"نہیں جس قدر رقم پہلے دے چُکے ہیں، اُس سے زیادہ دینے کو تیار ہیں۔"

"پھر اِنکار کیوں ہے؟"

"تم خُود پُوچھنا۔"

"چلئے! ضرور پُوچھوں گا۔"

دونوں کُرسیاں پیچھے سرکاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

رام چندر جی نے اجودھیا کی سرسبز ماحول چھوڑکر، اپنے بن باس میں، بندھیل کھنڈ کی خشک پہاڑیوں میں اس قدر زیادہ قیام کیوں کیا ؟

اس کے وجوہات رامائن کا مصنف کچھ بتاتا ہے اور کروی کی سرزمین کچھ، باندہ جیسے اجاڑ، گرم اور خشک ضلع میں کروی کی شاداب تحصیل کا وہی مرتبہ ہے جو ریگستان میں نخلستان کا ۔ گونڈ اور بھیل کی لٹیری قوموں نے رام جی کو اپنی آؤ بھگت سے یہاں رکنے پہ آمادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر کروی کی سرسبز پہاڑیوں، بے روگ آب و ہوا، اور نظر فریب قدرتی مناظر نے ضرور موہ لیا ہوگا ۔ 'جھانسی گلے کی پھانسی' 'دتیا گلے کا ہار' 'للت پور نہ چھوڑیو جب تک ملے اُدھار' بھی بندھیل کھنڈ کی سرزمین میں سرشی کی سی کیفیت ظاہر کرتا ہے اور اس اظہار کی تہ میں جو حقیقت پوشیدہ ہے اس سے آج بھی انکار ممکن نہیں ۔ رام جی کا یہاں قیام کرنا اور ایک پہاڑی کو اپنی ریاضت کے لئے مخصوص کرنا تھا کہ وہ چترکوٹ بن گئی، اُس کے برابر والی چھوٹی پہاڑی لچھمن جی کی خصوصیت سے لچھمن پہاڑی ہو گئی اور اس گھنے اور پہاڑی حصے میں، رام جی کی قدم بوسی کے لئے 'پے شنی' ندی نکل پڑی ۔

سیتا جی اسی کنارے رہنے لگیں اور سیتا پور کی بنیاد پڑ گئی ۔ ہنومان کے لئے، سامنے نظر آنے والے اونچے پہاڑی سلسلے پر 'ہنومان دھارا'

کا چشمہ اُبل پڑا۔ سیتا جی کو ستی انسویا سے ملنے کا وہ مقام۔ جہاں وہ بلندی سے دو جداگانہ دھاروں میں پھسلتی اور بہتی ایک دھار بن جاتی ہے، اسے اشنان کے لئے پسند آیا اور وہ 'جانکی کُنڈ' بن گیا۔ سیتا پور اور جانکی کُنڈ کے درمیان رام جی نے ایک رات اسی ندی سے نمایاں ہونے والی ایک چٹان پر گزاری جو اب 'پھٹک شِلا' کہی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ رام جی کے دم قدم سے یہ مقامات مقدس بن گئے اور چترکوٹ تیرتھ گاہ ہو گیا۔

کنور وچترکوٹ پہلی مرتبہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں، اپنی والدہ کے ساتھ اُن کے بیوہ ہو جانے کے بعد آئے تھے۔ اُس وقت وہ شباب میں قدم رکھ چکے تھے اور کروی کے مناظر سے متاثر ہوئے۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد بھی وہ ایک دفعہ چترکوٹ ہو آئے تھے۔ مغربی تعلیم، کاشمیری خاندانوں کی آزاد خیالی، ولایت کا سفر اور سب سے زیادہ آرٹسٹ کا مذاق! وہ مذہبی خیال سے اور تیرتھ کے لئے، چترکوٹ نہ جاتے ہوں، مگر تاریخی و قومی اعتبار کے علاوہ بھی کروی اور چترکوٹ اُن کو پسند تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تیرتھ گاہوں میں حسنِ انسانی کے جس قدر نمونے ایک ہی وقت میں نظر آ سکتے ہیں وہ اور جگہ میسر نہیں آ سکتے۔ وہ اجودھیا، متھرا، بنارس اور رامیشورم بھی اس دھن میں ہو آئے تھے، مگر چترکوٹ کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔

اُن کا کہنا تھا کہ مذہبی روایات کو چھوڑ کر، جو لطف چترکوٹ میں تھا وہ کہیں نہ تھا۔ اجودھیا اور متھرا میں زیادہ تر ممالک متحدہ کے لوگ ملتے تھے

یا پنجاب کے، بنارس میں وسطی اور جنوبی ہند والے بھی نظر آتے تھے، مگر
بہت کم، اور رامیشورم میں تو زیادہ مدراسی اور بنگالی ہی ملتے تھے۔ چتر کوٹ
میں بنارس اور متھرا کے مقابلے میں مجمع کم ہوتا ہو مگر شمالی، جنوبی اور وسطی
ہند کے لوگ یک جا نظر آتے تھے۔ وہ ہردوار اور بدری ناتھ بھی دیکھنا
چاہتے تھے مگر ابھی تک جا نہیں سکے تھے۔ یہ وجوہات ترجیح تو کنز رو عام
طور پر بتایا ہی کرتے تھے، مگر سلیم سے ایک اور وجہ بھی قبول چکے تھے۔

اُن کی رائے تھی کہ بندھیل کھنڈ کی آب و ہوا، عورت کے جسم و پیکر کو
مٹاپے اور سُکھاپے کی بدنما حدود سے بچاتی ہے اور عرصہ دراز تک
اُس کے نشیب و فراز کی چستی و رعنائی قائم رکھتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عموماً
پنجاب کی عورت بہت جلد فربہ، یوپی کی لاغر، بنگال کی کھدری اور اودھ
کی چمرخ ہو کر اپنے پیکر کو کھو دیتی ہے۔ مالوہ اور مدراس کی عورت قد کی
پستی کی وجہ سے پیکر کی انتہائی خوبی رکھتی ہی نہیں۔ اُن کی رائے میں،
پیکر کے اُتار چڑھاؤ اور خم و دور کے لئے کشیدہ قامتی ضروری تھی۔ یہ
غالباً چتر کوٹ کو ترجیح دینے کی خاص وجہ تھی۔

سلیم اُن کے ہم خیال نہ تھے، مگر سلیم نے نہ ابھی اس قدر دنیا دیکھی
تھی اور نہ کنز رو سلیم کی آنکھوں سے دنیا دیکھتے تھے۔

پہاڑ پر چڑھ کر انسان اور خدا کا فاصلہ کم ہو جاتا ہو یا پہاڑ کی بلندی
انسان کو ہموار زمین پر بسنے والوں سے اونچا کر دیتی ہو۔ لیکن یہ ناقابل
انکار واقعہ ہے کہ ہر زمانے کے ہر مذہب والے اور عابد و زاہد نے آبادی سے دور کسی نہ کسی چوٹی پر چڑھ کر ریاضت

کی اور اگر اُس کا وطن پہاڑیوں سے بھی خالی ہو تو جنگل یا غار تلاش۔ ایسے
مقامات پر توجہ کے لیے تنہائی خُد بہ خُد مل جاتی ہو، دھیان بٹنے کا کھٹکا
جاتا رہتا ہو، اور من و تو کے ظاہری اُلجھاوے ندارد ہو جاتے ہوں، مگر
غالباً فرصت کے اوقات میں بھی، صانعِ اصلی کے آبشاروں، وادیوں
اور مرغزاروں سے پیدا ہونے والے بے شمار نمونوں کے ماحول میں،
صرف میں ہی میں رہ جاتا ہے اور بار بار جھٹک مار کر ڈال ڈال اور پات
پات پر دوڑنے والے میں کو اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے
مطالعہ اور احساس کے لیے، فقط میں ہی نظر آتا ہے۔ یہ خدا کا لطف ہے
خود نہ کر دے تو کیا کرے؟

تیرتھ گاہ کے ساتھ جاتریوں، پجاریوں اور تیرتھی کاروباریوں کی
دُنیا بن جانا یقینی ہے۔ دیکھنے والوں کے لیے دکھانے والے، پھرنے
والوں کے لیے پھرانے والے اور سمجھنے والوں کے لیے سمجھانے والے
لازم و ملزوم ہیں۔ چترکوٹ میں بھی یہ گروہ موجود ہیں اور شاید بال میک
سے پہلے سے موجود ہیں۔ متعدد اکھاڑے اور ہر اکھاڑے کا ایک مہنت
رام بھگتی کی چھوٹی بڑی راج دھانیاں بن گئے ہیں جن کی باہمی مڈبھیڑ،
لاٹھی کے میدان سے لے کر عدالت کے کمرے تک، مہینوں ہوا کرتی ہے۔
بعض مہنتوں کی شان و شوکت بیل اور گھوڑے سے بڑھ کر ہاتھی تک
پہنچتی ہے۔ ہر مہنت کے ساتھ کافی جائیداد، مخصوص مندر اور پنڈوں
کا لشکر وابستہ ہیں اور چترکوٹ کی دنیا کا یہ رُخ انگریزی راج میں رام راج

کا چھوٹا سا جیتا جاگتا نمونہ نظر آتا ہے۔

اس تیرتھ گاہ کا دوسرا رُخ پچاسوں مندروں اور سینکڑوں گپھاؤں سے ظاہر ہوتا ہے، جن میں ہزاروں پجاری اور سادھو رات دن مگن رہتے ہیں۔ مندر زیادہ تر خاص چتر کوٹ کے گرد اگرد اور سیتا پور سے پھٹاں شلا تک اپنے شنی کے کنارے کنارے تعمیر ہیں۔ یہ مقدس ندی انگریزی راج اور راجاؤں کے راج کی حدِ فاصل یا دھار دُھرا بن کر دو مختلف قسم کے راجوں کو صرف دیکھنے دکھانے کے لئے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عمارتیں ہوں یا گپھائیں زیادہ تر انگریزی کنارے پر ہی نظر آتی ہیں۔ ان سادھوؤں میں بھی، ہرگرو کے ساتھ چیلوں کے جھتے، لمبے لمبے چمٹے لئے، جنگل میں منگل مناتے پھرتے ہیں۔ یہ کھوؤں میں بسنے اور جٹائیں بڑھانے والی تقریباً برہنہ اور بھبوتی بستی شاید رام کی تلاش میں، صدیوں سے کھوئی ہوئی ہے!

سیتا پور کی مستقل آبادی اگنتی کے اچھوتوں اور بھک منگوں کو چھوڑ کر پنڈوں کی ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں نہیں، بلکہ سنگین عمارتوں کا قصبہ ہے۔ سیتا پور کے مہنت جی اور مہنتوں کی طرح حکام رس بھی ہیں۔ سرکاری عمل داری کے مقامی حاکم اعلیٰ کروی کے سب ڈویژنل افسر ہیں جو کلکٹر باندہ کے برائے نام ماتحت ہوتے ہوئے کروی میں ہی رہتے ہیں۔ اس ذمے دار عہدے پر زیادہ تر آئی سی ایس کے نوجوان اور کم تر پراونشل کے سروس کے ادھیڑ تعینات ہوا کرتے ہیں اور کروی و مئو کی دو تحصیلوں میں یا تو جاڑے بھر سانبھر

ریچھ، گل داد اور شیر مارا کرتے ہیں، اور باگڑی بھرخس کی ٹٹیوں میں پنگھٹ کے پیچھے کر دی کے مہنتوں کے متعلق کچھ ایسے لطیف اندراج "بلو بک" میں کیا کرتے ہیں جیسے "یہ مہنت بڑا خرانٹ ہے مگر آتشک میں مبتلا ہے۔"

جگ موہن ناتھ کنزرو سیتاپور کے مہنت سے واقف تھے اور ہمیشہ انہی کی ایک سنگین عمارت کے دو منزلے پر ٹھہرا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی وہ مس موروتی اور سلیم کو ساتھ لئے اُسی دو منزلے پر آ رہے تھے، البتہ سلیم نے چند روز کے لئے من موہن ناتھ کنزرو کی کینچلی بدل لی تھی۔ سیتاپور کے مہنت اور پنڈتوں کو، یا چترکوٹ کے پجاریوں کو مسٹر کنزرو کے چچا زاد بھائی سے غیریت ہوتی تو کیوں؟ پہلے دن کنزرو مس موروتی اور سلیم کو چترکوٹ کے مشہور مقامات دکھاتے پھرے اور ایک سنگین وعظیم الشان مندر میں اورنگ زیب جیسے بدنام شہنشاہ کا مُہری و دستخطی فرمان دیکھا، جس کی رو سے ایک معقول جاگیر اس مندر کے نام ابدالآباد تک وقف کی گئی تھی۔ سلیم کو مؤرخین کی دیدہ دلیری پر انتہائی حیرت ہوئی۔ دوسرے دن سورج گرہن تھا اور تیرتھ گاہ کے جاتریوں میں جپ تپا اور بھجن دان کا بے پناہ ہنگامہ بپا رہا۔ کنزرو کو دراصل جھانسی پہنچنے تک سورج گرہن کا خیال نہ آیا، ورنہ وہ اس موقعے پر شاید نہ آتے۔ سورج گرہن کے روز وہ تو زیادہ تر دو منزلے سے نیچے بھی نہیں اُترے، مگر سلیم اور مس موروتی دن بھر چترکوٹ سے پھٹک شلا تک ننگے سر اور ننگے پاؤں ساری زمین ناپتے رہے۔

جاترہ کی تمام رسوم اوّل سے آخر تک دیکھ لینے کے بعد سلیم ششدر ہی نہیں تھا بلکہ غور وفکر میں ڈوب گیا تھا۔ وہ حاجی نہ ہوا مگر مناسکِ حج اُس کو بہت کچھ

معلوم تھے۔ تیرتھ کے رسوم دیکھنے میں مناسکِ حج یاد آجانا اور جاتریوں کا حاجیوں سے ذہنی مقابلہ پیدا ہو جانا فطری چیز تھی۔ اُس نے تیرتھ کے رسوم کا آغاز بھدرا کرانے اور ایک کورا کپڑا لپیٹ لینے سے دیکھا اور اُس کا ذہن احرام باندھنے اور حلق کرانے کی طرف منتقل ہو گیا۔ جاتریوں نے رام رام جپتے ہوئے چتر کوٹ کی پریکرما شروع کی کہ اُس کو حرم محترم کا طواف یاد آ گیا۔ لچھمن پہاڑی پر چڑھنے والوں نے راون کے پتھر مارے کہ صفا و مروا پر حاجیوں کی سعی اور منیٰ میں شیطان کے کنکر مارنا سامنے آ گیا۔ تیرتھ سے فارغ ہو کر جانکی کنڈ کا پوتر پانی صراحیوں میں لے جانا اور چاہِ زمزم سے زمزمیاں بھر لانا اُسے یکساں معلوم ہوتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اِس مماثلت سے کیا نتیجہ نکالے؟

گرہن چھوٹ جانے کے گھنٹہ بھر بعد سلیم اور شوبھی نے جانکی کنڈ پر پہنچنا چاہا۔ جاتریوں کا تانتا بندھا ہی تھا اور زد پر زد آتی تھی اور جاتی تھی۔ یہاں ندی کے دونوں جانب پہاڑیاں بہت بلند تھیں اور کنارے پر کوئی مندر نہ تھا۔ پُرسنی کی دو دھاریں سامنے سے علیحدہ علیحدہ بہتی ہوئی آتی تھیں اور اِس جگہ ایک ہو جاتی تھیں۔ اِن دونوں دھاروں کے درمیان پتھریلی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹاپو بن جاتا تھا جو پہاڑی جھاڑیوں اور اِکا دُکا ساگون کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سلیم کو پہلے دن کنور دیو نے اِس ٹاپو پر لے جا کر دکھا دیا تھا کہ وہاں جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ میں چند گز ہموار زمین کا ٹکڑا صاف

تھا اور جانکی کُنڈ کے قریب جمے ہوئے گُروجی اور اُن کے چیلے اکثر اُس
کم چٹے پر چرس کے دم لگایا کرتے تھے۔ اِن گروجی کے درشن سلیم نے
پہلے ہی دِن کر لیے تھے اور گُروجی نے کنٹر روسے اُن کے چچا زاد بھائی
کو دوسرے دِن ٹاپو سے جاترا دِکھانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آج گُروجی
دُھونی رمائے ناپدما آسن جمائے، آنکھیں بند کیے ابھیاس میں ڈوبے
ہوئے تھے اور سلیم سے بات کرنا تو کیا آنکھیں کھولنا بھی ناممکن تھا۔
سلیم اور مُورتی کنارے پر رُکے تھے کہ گُروجی کے ایک چیلے نے ان کی
آؤ بھگت شروع کر دی اور اُن کو ٹاپو پر چلے جانے کو کہا۔ سلیم نے
دھوتی اور مُورتی نے ساڑھی اونچی کر لی اور یہ دونوں پایاب ندی
کی ایک دھار، جو کسی جگہ پنڈلیوں سے زیادہ گہری نہ تھی، اُتر گئے۔
پانی جاتریوں کے وجہ سے کسی قدر گدلا ہو گیا تھا، اور پہلے دن کی طرح
سنگین تہ اور مچھلیاں صاف نظر نہ آتی تھیں۔ مگر وہ جاتریوں کے پھینکے ہوئے
آٹے کی گولیاں عمر بھر کھاتے کھاتے یہاں کے سادھوؤں اور پنڈتوں
سے کم حیا پائی اور نڈر نہ تھیں۔ سلیم اور مُورتی کے اُترتے اُترتے درجنوں
مچھلیاں ٹانگوں سے ٹکرائی ہی نہیں بلکہ پنڈلیوں کو نوچنے یا چاٹنے کی سی
حرکت کرتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دھار مچھلیوں سے اُبلی
پڑتی تھی اور سلیم و مُورتی کو ہر قدم پر مچھلی پیر تلے آ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔
آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے، آخر یہ دونوں پار ہو گئے۔ ٹاپو کی جھاڑیوں
سے گزر کر انہوں نے دیکھا کہ گُروجی نے اِن کے لیے کھلی ہوئی زمین

ایک چٹائی بچھوا رکھی تھی۔ پیر پھیلا کر بیٹھ جانے کے بعد سلیم نے مُورتی سے کہا۔

"اس جگہ کا منظر نہایت عمدہ ہے۔ میں تو سارے چتر کوٹ میں اس کا جواب نہیں پاتا۔"

"جی ہاں" مورتی نے جواب دیا "اور مچھلیاں کیسی نڈر رہیں۔"

"یہاں اُن کو کوئی چھو نہیں سکتا۔ جو کوئی آتا ہے تو کھلاتا ہے۔ اُن کو آدمی سے ڈر کیوں ہو؟"

"کل تو میں نے چنے پھینکتے پھینکتے ہاتھ روک لیا اور مٹھی قریب کر دی تو کئی مچھلیاں پانی میں سے میرے ہاتھ کی طرف اُچھلیں۔"

"میں بھی دیکھ رہا تھا۔ اُن کا بس چلتا تو ہاتھ پکڑ لیتیں۔"

"یہاں کی مچھلیاں تو آدمی سے ہلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔"

"اور آدمی مچھلیوں سے ہلے ہوئے۔"

"آدمی کے ہلنے کی بھی ایک ہی ہوئی۔"

"مذاق نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ بعض آدمی کُتّے سے ہلے ہوتے ہیں اور اجنبی کُتّے سے ذرا نہیں گھبراتے؛ بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ذرا موٹے تازے کُتّے کو دیکھا اور اُن کی پھونک نکلی۔ کُتّے پر ہی منحصر نہیں۔ بیل، بھینس، گھوڑا کوئی بھی لو۔ بعض آدمی اُن کو دیکھ کر ہکنے لگتے ہیں۔"

"یہ تو عادت سے یا ڈر سے تعلق ہوا۔"

"آپ عادت اور ڈرنا کہیئے؛ میں ہلنا کہتا ہوں۔ مطلب وہی ہے۔

عادت اور ڈر دو مختلف چیزیں ہیں مگر پلنا ان دونوں پر حاوی ہے"۔
"آپ لفظوں پر بہت غور کرتے ہیں؟"
"الفاظ سے ہی آدمی ہے"۔
"جانور بھی اپنی آواز سے اپنا مطلب ظاہر کرتے ہیں"۔
"جانور آواز سے صرف اپنی حالت ظاہر کر سکتا ہے، مگر بے شمار جانور ہیں جن کی آواز ہی نہیں ہوتی"۔
"وہ اشارے کرتے ہوں گے"
"مگر کلام تو کوئی بھی حیوان سوائے انسان کے نہیں کر سکتا"
"یہ صحیح ہے"۔
"اور دیکھو تو کلام بھی صرف نام یا اسم کا گورکھ دھندا ہے اور بس"۔
"اس سے آپ کا کیا مطلب؟"
"یہ کہ ہمارے کلام میں صرف اسم ہی اسم ہوتا ہے، اور کچھ نہیں"۔
"فعل اور حرف کہاں رہ گئے؟"
"فعل اور حرف بھی کوئی دوسری چیز نہیں۔ اسم ہی کے نام ہیں"۔
"یہ بھی ایک ہی ہوئی۔ آپ اپنی نئی قواعد بنائیے"۔
"میں کوئی نئی قواعد بنانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بنیادی غلط فہمی کی تشریح کرتا ہوں"۔
"وہ بنیادی غلط فہمی کیا ہے؟"

"یہی کہ قواعد بنانے والوں نے فعل و حرف کو اِسم سے جُدا کر دیا، حالانکہ یہ دونوں بھی اِسم ہی کی قسمیں ہیں۔ فعل کسی کام کے کرنے یا بات کے ہونے کا نام ہے اور حرف ایک اِسم کو دوسرے اِسم سے تعلق رکھنے والی صورت کا نام ہے۔ اِسم اشارہ، اِسم ضمیر، اِسم فعل، اِسم حرف۔ سب اِسم ہی اِسم ہیں۔"

"تو گویا ہمارا تمام کلام اِسم ہی کا طلسم ہے؟"

"اِس میں شک کیا ہے؟ — میں تو سمجھتا ہوں کہ خُدا نے صرف اِنسان کو نام رکھ لینے کی قوّت یا سُوجھ بُوجھ عطا کی ہے جو فرشتے کو بھی نصیب نہیں۔"

"فرشتے کا علم آپ کو کس طرح ہُوا؟"

"خُدا نے کب بتایا کہ فرشتے کو نام رکھنا نہیں آتا۔ میکائیل، اسرافیل، عزرائیل۔ یہ سب فرشتوں کے نام نہیں؟"

"فرشتوں کے یہ نام تو اِنسان نے رکھ لئے ہیں۔ یا خدا نے انسان کو سمجھانے کے لئے بتائے ہیں۔ فرشتوں نے تو نہیں رکھے۔"

"فرشتے جب خُدا کی عبادت ہر وقت کرتے ہیں تو کلام کرتے ہیں اور جب کلام کرتے ہیں تو نام کیوں نہ رکھتے ہوں گے؟"

"عبادت اور کلام سے کیا تعلق؟ شاید تم اِنسان کی پُوجا پاٹ، یا نماز و تسبیح پر فرشتوں کی عبادت کا تصوّر کرتی ہو۔ یہ غلط ہے۔ فرشتوں کی عبادت ویسی ہے جیسی تمام موجوداتِ عالم کی۔ جنگل، پہاڑ، برق، رعد۔ ہر چیز خدا کی عبادت کرتی ہے۔"

"کیوں کرتی ہے ؟"

"خدا کے حکم، منشا یا امر کی پابند رہ کر۔ وہ منشائے فطرت کے خلاف ایک لمحہ نہیں رہ سکتی اور یہی عبادت ہے۔ خدا کا امر یا قانونِ فطرت ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ صرف انسان ہے جس کو منشائے فطرت سے گریز کرنے کا اختیار ہے اور وہ اکثر روگردانی کر جاتا ہے۔"

"یہ اختیار بڑی چیز ہے یا نام رکھنے کی سوجھ بوجھ ؟"

"یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ایک ہی قوت۔ جس کا نام دماغی قوت ہے جو انسان کو مل گئی ہے۔ نام رکھنا بھی اسی قوت کی ابتدا و انتہا ہے۔ جب ہی تو خدا نے آدم کو صرف تمام عالم کی چیزوں کے نام سکھا دیئے اور فرشتوں سے اس کو سجدہ کرا دیا۔ دیکھو تو آدمی نے دنیا کی ہر چیز کے نام رکھ ڈالے۔ اس کا ریزہ ریزہ کر کے ہر ریزے کے نام رکھ ڈالے۔ جو نظر بھی نہ آتا تھا اس کا بھی نام رکھ ڈالے۔ اور اسی طلسمِ اسم سے علوم و فنون کے دفتر کے دفتر وجود میں آ گئے۔ اب بھی آدمی کسی نئی چیز کو پا لے تو سب سے پہلے اس کا نام رکھتا ہے۔ اس کی ظاہری صورت بیان کرنے میں نام سے کام لیتا ہے۔ اس کی حالت معلوم کرنے میں نام آتا ہے۔ جو ہر ہے سمجھو نام ہی نام ہے۔"

"آپ نقاش کے بجائے فلاسفر ہوتے اچھے لگتے ہیں۔"

"نقاش اور فلاسفر میں فرق ہی کیا ہے ؟ ایک شے کو سمجھنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے بنا کر۔"

"مگر سمجھتا کوئی بھی نہیں۔"

"مجھ سکتا تو آج چترکوٹ میں مجمع کیوں ہوتا۔ میں اور آپ جانکی کنڈ پر کیوں ہوتے؟ جانکی کنڈ کا منظر مجھے گرویدہ کیوں کرتا؟"

"آپ ہی کو نہیں، مجھے بھی یہ جگہ بڑی دل فریب معلوم ہوتی ہے۔"

"ذرا ٹھہریے۔ یہاں بھی ایک تصویر لے لوں۔"

سلیم دستی کیمرہ لئے اُٹھا اور اُس نے جانکی کنڈ کے ایک رخ کے نظارے کی تصویر لے لی۔ واپس آکر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا:۔

"مجھے تو یہاں کے ایک ایک مقام کی تصویر لے لینی ہے۔"

"ضرور لیجیے۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

"لطف تو جب ہو کہ آپ کی اِسی مقام پر، بلکہ جانکی کنڈ میں نہاتے ہوئے تصویر بنائی جائے۔"

"یہاں ماڈل بننے کے لئے تنہائی نہیں ہے۔"

"اگر کنور رو چاہیں تو تنہائی بھی کل یا پرسوں میسّر آسکتی ہے۔"

"وہ چاہیں بھی تو میں پسند نہیں کروں گی۔"

"یہ تو سوچ لیجیے کہ وہ تو پسند کریں اور آپ کو تامّل ہو، ہاں یہ کہیے کہ وہ پسند نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں چاہوں اور وہ پسند نہ کریں؟"

"میری کچھ کو آزما کے دیکھیے۔ آپ کو یقین ہو تو شرط کر لیجیے۔"

"کیا شرط ہے؟"

"اگر آپ اس جگہ اپنی تصویر کنور رو سے بنوالیں۔۔۔۔"

"اِس جگہ کا ٹھیکا نہیں، چِترکوٹ میں کسی جگہ؟"

"اچھا۔ چِترکوٹ میں کسی جگہ بھی تصویر بنوا لیں تو میں دس روپے دوں گا ورنہ آپ سے لے لوں گا؟"

"منظور۔ لاؤ ہاتھ مارو۔ مگر کُنور رُوپ سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

"بالکل نہیں" کہتے ہوئے سلیم نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور شرط ہو گئی۔ سلیم پھر اُٹھا اور اِس مرتبہ جھاڑیوں کے پاس جاکر، آڑ میں اُس نے چند جاتریوں کی تصویر لے لی۔ وہ پھر آیا اور مُورتی نے پوچھا: "کوئی صورت پسند آگئی ہے؟"

"نہیں۔ صرف جانکی کنڈ کا پانی پیتے ہوئے تصویر لینا تھی۔"

اِن دونوں کی بات چیت اور سلیم کا بار بار اُٹھ کر جھاڑیوں کی آڑ سے جاتریوں میں سے دو ایک کی تصویر لے لینا چار بجے تک جاری رہا۔ پھر یہ دونوں سیتا پور کی واپسی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرے دن جاتریوں کا طُوفان بہت کچھ کم ہو چکا تھا۔ پنڈوں کی دوڑ دھوپ، پجاریوں کا چڑھاوا، مہنتوں کی تحقیق و وصول، اور سادھوؤں کی نمائش ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ صبح کی چائے سے فارغ ہوتے ہی کُنور رُوپ نے مُورتی کو ساتھ لئے ہنومان دھارا کا رُخ کیا اور سلیم ایک پنڈے کو لے کر گُپت گوداوری دیکھنے چلے۔ رستے میں جاتریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ملیں تو سہی مگر اُس کا تانتا جا نارہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شِشر واپس یا دریائی طُغیانی

والے آج سویرے کے ساتھ درشن اور اشنان کرنے رہ گئے تھے
عام لوگوں کا ٹڈی دل چھٹ چکا تھا۔ گپت گوداوری سے پلٹتے
پلٹتے سلیم کو دوپہر ہو گئی اور اس نے یہ دوپہر بھی جانکی کنڈ کے
مندر کی۔ کئی گھنٹے تنہا گھاٹ پر بیٹھے اور پڑے رہنے میں اس نے
کئی تصویریں اور لیں اور تیسرے پہر تک واپس آیا تو کنزرو اور
مورتی کو دو منزلے پر موجود پایا۔ اس کو دیکھتے ہی مورتی ہنستی ہوئی
اٹھ بیٹھی اور بولی "دس روپے کا نوٹ نکالیے۔"

"کیوں؟ کیا آپ جیت گئیں؟" سلیم نے پوچھا۔

"ہاں! میں جیت گئی — آج میری تصویریں کھنچوا مان دھا۔ اپربنانی
شروع ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟" کنزرو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کیا تم سے اور
سلیم سے اس کی بابت شرط تھی؟"

"ہاں! کل ہی شرط ہوئی تھی" مورتی نے جواب دیا۔

"مار دیا ظالم!" کنزرو نے سلیم سے کہا "تم تو بڑے
شریر نکلے۔"

"کیوں — کیا ہوا؟" مورتی نے کنزرو سے سوال کیا۔

"ہوا کیا — اس ظالم نے رات کو مجھ سے پچیس روپے
کی شرط کر لی۔"

"کیا شرط کر لی؟"

"میں نے کہا کہ میں چاہوں تو تمھاری تصویر یہاں بھی بنا لوں ۔ مگر (سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) انھوں نے حجت کی کہ تم ہرگز یہاں تصویر بنوانے پر راضی نہیں ہوگی۔ اسی پر شرط ہو گئی......"

"تو پھر تم نے مجھے ہنومان دھارا پر بتایا کیوں نہیں؟" مورتی نے پوچھا۔

"بتاتا کیسے ۔ یہ بھی تو ٹھہر گیا تھا کہ تم پر ظاہر نہ کیا جائے۔"

"اس میں ہوا کیا؟ سلیم نے ہنستے ہوئے کنزرو سے کہا "آپ دس روپے انہیں دیدیں اور رینڈرا کی مجھے۔"
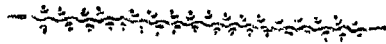
مُشران صاحب ساکنِ فرخ آباد، جو خود کاشمیری تھے، کاشمیری خاندانوں کی ذات کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ان کاشمیری ذاتوں سے وہاں کے برہمنوں کے آبائی پیشوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً نہرو سے مطلب ہے کہ یہ لوگ غوطہ خور تھے؛ کُنزرو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنجڑے تھے؛ سپرو سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سپیرے تھے؛ شرغا بتاتا ہے کہ یہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے؛ بخشی سے جھلکتا ہے کہ یہ بخشی کے عہدہ پر مامور تھے؛ چاک سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ چکوے ہوں گے؛ اور خود مُشران سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مِصر یا سردار تھے۔ مُشران صاحب مرحوم کا یہ قول خصوصاً پُر لطیفہ ہو یا اس کی تاریخی اصلیت بھی ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ تشریح نہایت لگتی لگاتی ضرور ہے۔

جگت نرائن شرغا کا آبائی پیشہ اس دلچسپ روایت کے لحاظ سے گھوڑوں کی سوداگری ظاہر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "دوہاجو کی بیوی اور سوداگر کا گھوڑا، جتنا اچھے اتنا ہی تھوڑا۔" جگت نرائن کی موجودہ بیوی راج کماری دوہاجو کی بیوی بھی تھیں اور شاید اپنے جاں نثار شوہر کے آبائی پیشے کے لحاظ سے سوداگر کا گھوڑا بھی سمجھی جا سکتی ہوں، بہرحال ان میں سوداگر کے گھوڑے کی بہت سی

صفات ضرور تھیں۔ اُن کے اُچھلنے کی عمر تو عرصہ ہوا کہ آئی گئی ہو چکی تھی مگر اُن کا
مزاج البتہ نہ جانے والا تھا نہ گیا۔ تیز، ترش اور تنک مزاج بیوی سلیم اور سادہ
لوح شرما پر ہمیشہ سوار رہیں، اور وہ ہمیشہ اِن کم خرچ و بالا نشین ٹونگی
پیٹھ پر سواری دینے میں بھی آنند رہے۔

جگت نرائن شرما نے آٹھ برس ہوئے کہ دہ سلسلے میں آکر الٰہ آباد
میں کمشنر کے ہیڈ اسسٹنٹ کی حیثیت سے پنشن لی تھی۔ اُن کے خرچ میں
تھوڑی بہت کمی ہوئی ہو، مگر جائز آمد اور جبا گئی تھی اور دست غیب بلا کر
چھپا گئی تھی۔ اِس انقلاب نے۔ اج کماری کو چالیسویں سال سے ہی
چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اولاد کے لحاظ سے جگت نرائن کے ہاں پہلی بیوی سے
تو چھوٹے کا بچہ بھی نہیں ہوا، البتہ اِن سے ایک لڑکی اُس زمانے میں
ضرور ہوئی جب مسٹر شرما کانپور میں کالکٹر کے آفس سپرنٹنڈنٹ کی صورت
میں دو برس رہے۔ یہ اکلوتی صاحبزادی سرلا اب بھگوان کی کرپا سے
۱۹ ویں سال میں چٹکنے والی کلی ہو چکی تھیں۔

سرلا اسی سال ڈگری لے کر تعلیم سے فارغ ہوئی تھی اور ماں باپ
اُس کے پروان چڑھنے کی فکر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سرلا کا سراپا تو
سیر والوں کو سر دینے پر آمادہ کر دیتا، مگر اُس کی اُفتاد نے کسی کو پیر تک
نہ چھونے دیا۔ وہ اکثر اعتبار سے معجونِ مرکب یا ماءُ اللحم دو آتشہ تھی؛
وہ سادہ مزاج ہونے پر بھی ذہین اور سریع الحس تھی! ممکن ہے کہ
اُس کی سادہ زندگی ماں باپ کی عسرت کا نتیجہ ہو کیونکہ اُس نے

ہوش سنبھالتے ہی روٹی اور ٹلا شوربا ہی دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پیٹ کی فکر بقیہ تمام جسم کی فکر پر غالب آجاتی ہے۔ اِنسان کا اِنسان ہونا اِسی فکر پر منحصر نظر آتا ہے۔ جہاں یہ فکر نہیں ہوتی اِنسان فرشتہ ہوتا ہے اور فرشتے کی معراج تو شیطان ہی ہے۔ گویا دُنیا محض پیٹ کی فکر کا دوسرا نام ہے اور اِس فکر کے دو انتہائی حُدود کا نام جنت و دوزخ ہے۔ اپنی دُنیا آپ بنانے میں دیر ہو مگر کبھی اندھیر نہیں ہوتا۔ صبر اور یقین ہے تو سب کچھ ہے۔

راج کماری کی راجدھانی شرغا کی پنشن سے بڑی بن گئی ہو مگر گھر کے اندر اُس کا سوراج برابر چلا جاتا تھا۔ اُس کو کئی کئی سال سے سرلا کی اُٹھتی جوانی کی فکر بڑھتی جاتی تھی اور اُس کے ساتھ شرغا بھی آزردہ کیوں نہ بے چین ہوتے جاتے؟ سرلا خود بھی دو تین برس سے کچھ نئی چیز نئی کیفیت یا نئی خواہش محسوس کرنے لگی تھی۔ مگر یہ احساس تعلیم کی تاروں بھری رات میں اُفق کے پاس کبھی کبھار ہو جانے والے چوندے سے کبھی آگے نہ بڑھا۔ البتہ ڈگری لے لینے کے بعد سے یہ جھجک اکثر ہونے لگی تھی، اور بجلی قریب تر ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ راج کماری اِس فطری انقلاب سے واقف تھی اور اپنی جوانی بھول نہیں سکتی تھی۔ اُس نے شرغا کو اِس سال مجبور کیا اور یہ دونوں سرلا کو ساتھ لیے رام سے لَو لگائے، تیرتھ کے لیے چترکوٹ چلے گئے۔ وہاں سیتا جی کے مندر میں راج کماری نے دل کھول کر دہائی دی۔

واپس آکر اِن تینوں کو اپنی اپنی مُراد بر آنے کا یقین تھا اور
اِس لحاظ سے مایوسی کا بوجھ ہلکا ہو کر نئے سرے سے امیدیں پیدا ہوگئی
تھیں۔ شرفا کی آرزو تھی کہ اُن کو سرکار دوبارہ ملازمت پر بُلا لے؛
کُماری کی تمنّا تھی کہ اُسے مُنہ مانگا داماد مل جائے؛ اور سرلا کی خواہش
تھی وہ خود کسی دھندے سے لگ کر اپنے ماتا اور پتا کو اپنی طرف سے
بے فکر کر دے۔ یہ اُمیدیں تھیں اور وہی چھوٹا سا دریا گنج کا کوٹھا جو تین
روپے مہینے پر اِن کے پاس کرائے پر تھا۔ دو دروازے والا کمرہ،
بغلی والا ایک درہ، برآمدہ، باورچی خانہ، پاخانہ، غسل خانہ اور تنگ
صحن اِس عمارت کی تشریح تھی۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے درمیان
نل کی ٹونٹی تھی اور کمرے، بغلی درے اور برآمدے میں بجلی کا ایک ایک
بلب تھا۔ مکان میں کوئی بجلی کا پنکھا نصب نہ تھا، مگر شرفا کے اسباب
راحت میں ایک اچھا خاصہ گھومنے والا پنکھا تھا جو آٹھ برس سے کمرے
اور برآمدے میں گھومتے گھومتے اِس قدر تھک گیا تھا کہ چیختے چلاتے چلنے
سے جواب دے جاتا تھا، بڑا کمرہ تو سارے گھر کا مشترکہ اُٹھنے بیٹھنے اور
جاڑوں میں سونے والا کمرہ تھا، مگر بغلی کا کمرہ زیادہ سرلا کے لئے
مخصوص تھا۔ برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز اور تین کرسیاں تھیں جو
سال کے آٹھ مہینوں میں برآمدہ ہی نشست اور کھانے کے کمرے کا کام
بھی دیتا تھا۔
چتر کوٹ سے واپسی کے دوسرے دن، گیارہ بجے کے قریب شرفا

اور کماری، سرلا کی واپسی کے انتظار میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے:

"میں تو نہیں چاہتی کہ سرلا نوکری کرے!" کماری نے کہا۔

"پھر تم نے اُسے جانے کیوں دیا؟" شرما نے پوچھا۔

"جانے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تو وہ معلوم کرے گی کہ ملازمت کیسی ہے اور تنخواہ کیا ہے۔"

"اور معلوم کر کے اُس نے جگہ پسند کی تو؟"

"تو میں اُسے سمجھاؤں گی اور درخواست نہیں دینے دوں گی۔"

"جس راستے چلنا نہیں تو اُس کے کوس گننے سے کیا فائدہ؟"

"فائدہ تو کچھ نہیں مگر میں نے اُس کا دل میلا کرنا نہیں چاہا۔"

"یہ ہی تو غلط ہے۔ اُس کے دل میں اُمید ہی پیدا کرنی نہیں چاہیے!"

"تم تو عورت کی طبیعت نہ کبھی سمجھے نہ سمجھ سکتے ہو!"

"کم سے کم دو عورتوں کی طبیعت تو سمجھ سکا؟"

"خاک سمجھ سکے۔ ایک کو مار کے پار اُتار دیا اور دوسری کو جیتے جی مار دیا!"

"مرنے والی کا تو ذکر چھوڑو مگر تمھارے لیئے تو میں نے ساری زندگی بیچ دی!"

"اس سے مجھے کب انکار ہے!"

"پھر بھی میں تمھیں سمجھا نہیں؟"

"ہاں۔ سمجھے تو خاک بھی نہیں!" کماری کی پھیکی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے دہانے پر مسکراہٹ نمایاں ہو گئی۔

اگر میں تمھیں نہیں سمجھا تو شاید کوئی مرد کبھی عورت کو نہیں سمجھتا!"

"میں تو یہ ہی سمجھتی ہوں۔"

"ہر عورت یہ ہی سمجھتی ہے اور اسی سے اس کی ناقص عقل کا پتہ چلتا ہے۔"

"تم تو ہمیشہ ہر بات میں یہ ہی طعنہ دیا کرتے ہو۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ تم سے بات کروں۔ تمہیں میری حالت کی بھی پروا نہیں۔ مجھے مجحلت کرنے سے دھڑکن ہونے لگتی ہے مگر تم ہر بات میں مین میکھ نکالتے ہو۔"

"مجھے تم کو ستانا نہیں تھا۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔"

"تمہاری تو ایک بات ہوتی ہے اور میرے اوپر بن جاتی ہے کہ کہیں دورہ نہ پڑ جائے۔"

"معاف کرو۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔"

"تم تو نہیں چاہتے کہ سرلا نوکری کرے؟"

"نہیں۔ میں نہیں چاہتا۔"

"تو پھر میں اسے سمجھاؤں گی۔"

"ضرور سمجھاؤ۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ شریفوں کی بہو بیٹیاں نوکری کریں۔"

"سچ کہتی ہو۔ مجھے بھی بُرا لگتا ہے پر آج کل تو یہ ہی ہوا چل پڑی ہے۔"

"بہت بُری ہوا ہے۔ عورتیں اپنی آزادی کو کھوئے دیتی ہیں۔"

"اور کہتی یہ ہیں کہ ہم آزادی اختیار کر رہے ہیں۔ ہم اپنی روزی

کے لیۓ مردوں کے محتاج کیوں رہیں۔"

"مردوں کی محتاجی کیسی۔ عورت کے جنم کا حق ہے کہ وہ بیٹھ کر کھلائے اور مرد کمائے۔"

"سچ کہتی ہو، عورت کے لیۓ اپنا گھر بار سنبھالنا ہی بہت ہے۔"

"میکے میں گھر بار کا کام کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں، پر سسرال میں ساس نندیں کس لیۓ ہیں؟ ۔ پتی کے ہاں تو استری گھر کا شبھاؤ ہے۔"

"سچ کہتی ہو، اولاد استری کے بھاگ سے ہوتی ہے اور دھن پتی کے بھاگ سے۔"

"گود بھرنے تک تو عورت کو کوئی چنتا نہیں ہونی چاہیۓ؟"

"میری رائے میں تو کبھی بھی نہیں ہونی چاہیۓ۔ ہمارے دھرم میں تو عورت بڑی چیز ہے، نہیں تو جب تب میں سیتا اور رادھا کا نام رام اور کرشن سے پہلے کیوں لیا جاتا؟"

"جب تب کو چھوڑ دو تو بھی مردوں تک کے نام سیتا رام اور رادھا کرشن ہی ہوتے ہیں۔"

"بیاہ کے لیۓ بھی عورت ہی کی چلتی تھی۔ اگلے وقتوں میں سیمبر ہوتا تھا اور عورت ہی کو اختیار تھا کہ جس کو چاہے پسند کر لے۔ اور اس کے گلے میں ہار ڈال دے۔"

"وہ ست یگ تھا، اب کل جگ ہے۔ اب تو کنیا کو بر ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"آج کل کے نوجوان تو دام چاہتے ہیں - وہ عورت نہیں ڈھونڈتے پیسہ ڈھونڈتے ہیں۔"

"اسی وجہ سے پڑھی لکھی لڑکی چاہے کیسی ہی نیک ہو اگر وہ مال دار نہیں ہے تو اس کو عزت دار خاوند نہیں ملتا۔"

"لیکن صورت اچھی ہو تو اچھے اچھے ریجھنے لگتے ہیں۔"

"ریجھنے تو لگتے ہیں لیکن مال دار ہوتے تو شادی نہیں کرنا چاہتے - فقط اپنے پیسے کے بل پر غریب عورت کی عزت لینے کی فکر میں رہتے ہیں۔"

"مگر میں نے تو جب دن سے تمھیں دیکھا شادی کی ہی ٹھان لی۔"

"خیر - ہماری تمہاری تو اچھی بیت گئی - اب تو سرلا کی کہو۔"

"سرلا کے لئے بھی بھگوان بھلی ہی کریں گے۔ وہ تو سر سے پیر تک تمہاری تصویر ہے - تمہیں چھپا دو اسے نکالو - بال برابر فرق نہیں۔"

"دیکھنا! اس دفعہ سیتا پور میں جگ موہن ناتھ کنور سرلا کو بری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"

"اچھا! یہ کس دن؟"

"گرہن والے دن۔ جب ہم جانکی کنڈ سے پلٹ رہے تھے تو وہ کوٹھے کے برآمدے سے آنے جانے والوں کو گھور رہے تھے۔"

"میں کہاں تھا؟"

"تم بھی ہمارے ساتھ تھے پر تم نے اوپر کی طرف دھیان نہیں کیا۔"

"جگ موہن بیچے اکیلے ہی! شاید اُن کو ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی چاہیتی کو چیتر کوٹ لے جاتے۔"

"کون؟ مس موُرتی؟"

"مس آئی ہی کہیں کی۔ فاحشہ۔ رنڈی۔ دلی کا بچہ بچہ اُسے مُشتری کے نام سے جانتا ہے۔"

"اُس کا نام تو مشتری ہی ہے۔ مس مُورتی تو فلم کمپنیوں نے بنا دیا۔ اچھا تو جگ موہن نے سرلا کو دیکھ لیا؟"

"ہاں! دیکھ لیا۔ پر ہماری لڑکی نے اُن کو نہیں دیکھا۔ وہ تُم سے باتیں کر رہی تھی۔"

"یہ بُرا ہوا۔ ورنہ سرلا کی مرضی ٹٹولتے۔"

"واہ وا۔ کیا کہنا!"

"کیوں جگ موہن میں کیا عیب ہے؟"

"ایک فاحشہ، کسبی کو نوکر رکھے ہوئے ہے اور تم پوچھتے ہو کیا عیب ہے!"

"مشتری نے تو کبھی کسب کیا نہیں۔"

"جی ہاں! تم تو اُس کی پٹی سے پٹی بھڑائے رہتے ہو نا۔ یہ فلم والی عورتیں فاحشہ نہیں ہوتیں تو بہو بیٹیاں ہوتی ہیں؟ تمہاری لڑکی کسی فلم کمپنی میں جانا چاہے تو تم اجازت دے دو گے؟"

"ہرگز نہیں۔ مرتے دم تک بھی نہ دونگا۔"

"تو پھر؟"

"کچھ نہیں۔ وہ فاحشہ ہی ہوگی۔ میں تو جگ موہن کی بابت کہہ رہا تھا۔"

"جگ موہن ہی کیا بلا ہیں؟ فاحشہ کو نوکر رکھتے ہیں تو عیاش ہیں، بدمعاش ہیں۔ پیسے والے اُن جیسے ہزاروں۔ پھر دُبلے پتلے، گول دیدوں والے۔ مجھے ایسے ہوائی سے مرد ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ مرد کبھاری بھرکم نہ ہو تو مرد ہی کیا ہوا۔ میری سرلا تو شاید اُن کا پرچھاواں کبھی نہ پڑنے دے۔"

"سچ کہتی ہو۔ ٹھیک کہتی ہو۔ سرلا کو جتنا تم سمجھ سکتی ہو میں نہیں سمجھ سکتا۔"

"ہاں۔ شاید وہ نوجوان جو ہمارے ساتھ کروی سے ریل میں سوار ہوئے سرلا کو پسند آئے ہوں۔"

"وہ نہایت باتمیز معلوم ہوتے تھے: محض اس وجہ سے کہ شاید ہم سب کو تکلیف ہوتی ہو، بیچارے جھوسی کے اسٹیشن پر ہی اُتر کر دوسرے درجے میں چلے گئے۔"

"میں یہ سمجھی تھی کہ وہ جھوسی پر ہی اُترنے والے تھے کیونکہ انہوں نے سارا اسباب بھی اُتروا لیا مگر پھر جھانسی پر میں نے اُن کو ٹہلتے دیکھا...."

"جھانسی کیسی۔ وہ تو دِلّی تک آئے اور غالباً دِلّی کے ہی رہنے والے ہیں۔"

"صورت شکل سے تو کشمیری سے معلوم ہوتے تھے۔ ہماری سرلا کو برابر خاص نظروں سے دیکھتے رہے اور سرلا بھی اُن کی آنکھ بچا کر یا کن انکھیوں سے بار بار اُن کو دیکھتی تھی۔"

"ہاں! میں نے بھی دونوں کی نظریں بھانپ لی تھیں۔"

"اگر وہ عزت دار ہوں تو سرلا کا بڑا اچھا جوڑ ہیں۔ بھاری بھرکم۔ لمبے تڑنگے۔ ناک نقشے کے بہت اچھے۔ مجھے تو وہ خوبصورت اور شاندار معلوم ہوتے تھے۔"
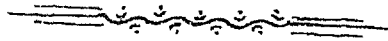
رام جی نے سب سے پہلے جس کی مُراد پُوری کی وہ سَرلا تھی؛ ممکن ہے کہ حُسن و شباب کو دُعا مقبول ہونے میں بھی خاص دخل ہو۔

دہلی آل انڈیا ریڈیو نے چند نئی آسامیوں کا اعلان کیا اور کوڑیوں درخواستیں ڈاک کے ذریعہ سے مَوصُول ہوگئیں۔ ان ہی میں دو آسامیوں کا تعلق عورتوں سے تھا۔ یعنی۔ زنانے پروگرام کے لیۓ دو نشر کرنے والی لڑکیوں کی حاجت تھی، جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خوش آواز بھی ہوں۔ درجنوں عورتوں کی درخواستیں تھیں، مگر صرف پانچ انتخاب کے لیۓ بلائی گئیں۔ اِن پانچ میں سرلا کا ہونا رام جی کی کرپا ہو، مگر آخری دو میں آجانا بہت کچھ سلیم کے دِلی جذبات کا نتیجہ تھا۔ سلیم ترقی کرتے کرتے پروگرام اکزیکیوٹو کے عہدے پر پونہچ چکے تھے اور ساے۔ آئی۔ آر کے کرتا دھرتا مسٹر بخاری نے خواست گاروں کو آواز کے امتحان کے لیۓ سلیم پر چھوڑ دیا تھا۔ آواز کا جائزہ سلیم نے ایک دِن کے بجائے دو دِن لیا اور اِس دو دِن میں کم سے کم چار دفعہ اُس کو سَرلا سے بات چیت کرنے اور نظروں نظروں میں یہ جتا دینے کا موقعہ مِلا کہ اُس کا انتخاب صرف سلیم کی عنایت کا نتیجہ تھا۔

سرلا کو انتخاب کے لیۓ ریڈیو گھر پونہچنے کے پہلے ہی دِن، سلیم سے

دوچار ہوتے ہی، اپنی کامیابی کا یقین سا تھا۔ راج کماری نے
ملازمت سے باز رکھنے کے لئے سرلا کو سمجھایا، پھسلایا اور روکا، مگر
یہ سن کر کہ کروی سے ریل میں ہم سفر ہونے والے نوجوان سے واسطہ
تھا، وہ بھی پگھل گئیں۔ سرلا کو اپنے والدین کے شانہ بدوش کر دینے
اور خود کما سکنے کی مسرت اور امنگ تو تھی ہی، مگر سلیم سے روزانہ
مل سکنے کی صورت پیدا ہو جانے سے جو اندرونی کیفیت محسوس ہوتی
تھی وہ مسرت اور امنگ سے بھی جداگانہ تھی۔

سلیم کے لئے سرلا کا ریڈیو گھر میں ملازم ہو جانا اندھے کو دو آنکھیں
مل جانا تھا۔ اس نے جانکی کنڈ پر دو دفعہ سرلا کی تصویریں لیں۔ پہلے
دن تو سرلا کے ساتھ اُن کی سن رسیدہ ماں بھی تصویر میں تھیں لیکن
دوسرے دن نہاتے ہوئے صرف سرلا ہی تھی۔ دستی کیمرے سے تصویر
لینے سے پہلے، اس کی آنکھیں اس صورت کی تصویر دل پر اتار چکی
تھیں۔ چترکوٹ سے واپس آتے ہی، سلیم نے سرلا کا فوٹو پنسل سے
بڑے سائز پر کھینچ لیا اور اس ارادہ سے کھینچ لیا کہ اس بڑی تصویر
سے وہ رنگین تصویر کینوس پر بنائے۔ لیکن یہ ارادہ سرلا کی ملازمت
سے پیشتر کی بات تھی؛ اب تو وہ اس تمنا میں ڈوب گیا تھا کہ خود سرلا کو
سامنے بٹھا کر اس کا سراپا کینوس پر اتار لے۔ یہ موقعہ ہاتھ آنا،
بے تکلفی ہو جانے پر ہی نہیں بلکہ باہمی اعتماد ہو جانے پر مبنی تھا اور یہ
اعتماد دو دلوں کی کیفیت پر منحصر تھا۔ سلیم کو سرلا کے دلی ترجمان کا

شبہ بھی نہ تھا، مگر سرلا نے سلیم کی آنکھوں سے دل میں اتر کر اس کی حالت سمجھ لی تھی۔ سلیم سرلا کے ساتھ پینگ بڑھانے چاہتا تھا اور سرلا بھی، کسی قدر پس و پیش تامل کے بعد، لگاؤ کے جھونٹوں میں لطف اٹھاتی تھی۔

ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ اتوار کے دن سرلا اور سلیم رات کے آٹھ بجے ریگل سینما میں ایک نیا فلم دیکھنے میں مشغول تھے۔ فلم کی تصویریں پردے پر متحرک تھیں، سارے وسیع ہال میں اندھیرا تھا اور سرلا و سلیم اول درجے کی سب سے پچھلی قطار میں، کرسیوں پر ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

"اس پکچر میں تو مس موروثی نے بلا کا ایکٹنگ کیا ہے" سرلا نے کہا۔

"اس کی ہر تصویر ایسی ہی ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی ایکٹرس ہے" سلیم بولے۔

"کیا اس کی شکل و صورت بھی ایسی ہی ہے جیسی پکچر میں معلوم ہوتی ہے؟" سرلا نے پوچھا۔

"ہاں ایسی ہی۔" سلیم نے جواب دیا۔

"مگر پکچر کے لئے تو یہ سب بہت بہت میک اپ کرتی ہیں۔ پکچر کی صورت کا اعتبار کیا ہے؟"

"بے شک۔ یہ صحیح ہے، مگر موروثی کی صورت دراصل تصویر سے بھی بہتر ہے۔"

"آپ نے اُسے دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہی نہیں، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"وہ آوارہ عورت ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"اُس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا۔"

"تھا نہیں، ہے۔ اُس کا نام مُشتری ہے۔"

"ایسے نام تو طوائفوں کے ہوتے ہیں؟"

"اُس کی ماں زُہرا طوائف تھی: اُسی نے یہ نام رکھا تھا۔"

"تو مُشتری بھی طوائف ہوئی؟"

"نہیں۔ اُس نے کبھی گانے، ناچنے کا پیشہ اختیار نہیں کیا: بلکہ کالج تک تعلیم حاصل کی۔"

"آپ اُسے بدچلن اور ــــ اور ــ فاحشہ نہیں سمجھتے؟"

"جب وہ بدچلن اور فاحشہ ہے ہی نہیں تو کس طرح سمجھوں؟"

"ماتا جی تو اُس کو طوائف کہتی ہیں۔"

"وہ اس وجہ سے کہتی ہونگی کہ مُشتری ہے تو آخر ایک طوائف ہی کی لڑکی۔"

"طوائف کی لڑکی طوائف نہیں ہوئی تو اور کیا ہوئی؟"

"طوائف ذات تو نہیں ہے، نہایت ذلیل اور فحش پیشہ ہے لیکن جو اِس پیشے کو نہ کرے وہ طوائف نہیں کہی جا سکتی: طوائف کی اولاد ضرور ہوگی۔"

"بڑھئی کی اولاد اگر اپنا پیشہ نہ کرے تو بڑھئی نہیں کہی جائے گی؟"
"بڑھئی صرف پیشہ ہی نہیں رہا بلکہ ہمارے ہاں ذات ہو گئی، اس لئے اُس کی اولاد بڑھئی کا پیشہ کرے یا نہ کرے بڑھئی ہی کہلاتی ہے۔"
"اچھا یہی سہی تو مُشتری کی ذات کیا ہے؟"
"یہ سوال تو بہت مشکل ہے۔" آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے سلیم نے جواب دیا "یہاں تو میں بھی لاجواب ہوں۔"
"کیوں؟"
"کیوں کہ ذات باپ سے چلتی ہے اور اُس کے باپ کا علم نہیں۔"
"اچھا تو یہ ہی بتائیے کہ اب اُس کا پیشہ کیا ہے؟"
"وہی جو ہمارے مال داروں کا ہوتا ہے۔"
"اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"
"پیشہ تو دراصل وہ ہے جس سے انسان اپنی روزی کمائے۔ آبائی پیشے کے لحاظ سے زمینداری، سوداگری، نوابی وغیرہ پیشہ سمجھ لینا غلطی ہے۔ مال داروں کا پیشہ سیاحی، وقت کشی، چارپائی توڑنا، آنند کے تار بجانا ہی ہو سکتا ہے۔"
"یہ تو شغل ہوا! پیشہ کہاں ہوا؟"
"بے شک مشغلہ ہوا۔ مگر اِن مال داروں کو پیشے سے واسطہ ہی نہیں! غریب اور حاجت مند کماتا ہے اور مال دار اُڑاتا ہے۔ مال دار کا پیشہ کھانا اور اِٹھلانا۔"

"کیا مشتری لکھ پتی ہے؟"

"لکھ پتی نہ سہی، مگر اُس کی ماں زہرہ نے ڈھائی تین سو روپے مہینے کی جائیداد چھوڑی۔ پھر اُس نے خود بھی فلم کمپنیوں سے ہزاروں کما کے اور جائیداد دُگنی تِگنی کر لی۔"

"اُس کی ماں کی جائیداد تو حرام کی کمائی ہوئی۔ وہ حرام کی کمائی تو کھا رہی ہے؟"

"حرام کی کمائی تو زہرہ کے جیتے جی کہی جا سکتی تھی۔ ورنہ آج کل کے لکھ پتی لوگوں کی میراث بھی حرام کی کمائی ہو گی۔"

"یہ کس طرح؟"

"اس طرح کہ ان لکھ پتیوں کے مورثوں نے کاشتکاروں، مزدوروں، ملازموں اور محتاجوں کا خون چوس چوس کر ہی یہ مال پیدا کیا تھا۔ یہ حرام کا مال نہیں تو حلال کا کدھر سے ہوا؟"

"اچھا کچھ بھی نہ سہی! یہ تو پتہ نہیں، کہ وہ بھنگی کی اولاد ہے یا چمار کی؟"

"مگر یہ کسی اولاد کو بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی اولاد کو اپنے باپ کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ اِس بات پر والدین کے یقین پر اولاد کا یقین پیدا ہوتا ہے اور بس۔"

"زہرہ کیا کہتی تھی ؟"
"زہرہ تو مشتری کو آنریبل ہردے نرائن کی لڑکی بتایا کرتی تھی۔"
"جھوٹی لپاٹن - ہردے نرائن جی پر تہمت باندھتی ہوگی۔"
"ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ تو ہے نہیں۔"
"اور ایک فاحشہ کو سچا سمجھنے کی کیا وجہ ہے ؟"
"ایک نہیں کئی وجوہات ہیں ۔ زہرہ ہردے نرائن کی ملازم تھی، مشتری کی صورت شکل بھی بالکل ہردے نرائن کی سی ہے، اور انہوں نے اپنی چاوڑی بازار والی جائیداد مشتری کے ہی نام وصیت کردی ...."
"اچھا! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"
"مگر میں اس سے بھی زیادہ ایک اور وجہ پاتا ہوں۔"
"وہ کیا ہے ؟"
"وہ یہ ہے کہ مشتری خود بھی ایک کاشمیری سے ہی محبت کرتی ہے۔"
"یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"
"یہ تو سب سے بڑی بات ہے۔ مشتری پر بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار فدا ہو گئے مگر اس نے کسی کو منہ نہیں لگایا اور محبت کی بھی تو جگ موہن ناتھ کنزرو سے۔"
"وہ تو کنزرو کی ملازم ہے۔"

"نہیں، یہ شہرت بھی غلط ہے ۔ وہ کنزرو کی ملازم نہیں ہے ۔"

"ملازم نہ ہو مگر دولت پر اُس کا دانت ہوگا ۔"

"قطعی نہیں ۔ اُس کو تو بمبئی ٹاکیز کا ایجنٹ ایک فلم بنانے کے لئے اسی مہینے میں پانچ ہزار تک دیتا رہا مگر وہ کنزرو کو چھوڑ کر نہیں گئی ۔ صاف انکار کر دیا ۔"

"مشہور تو یہ ہی ہے کہ مسٹر سی کنزرو کی ملازم ہے اور اُن کی دولت کو چاٹے ڈالتی ہے ۔"

"سچ ہے 'بد اچھا بدنام بُرا' ۔ یہ طبقہ بدنام بہت ہے ۔"

"اور آپ اِس طبقے کو سماج میں سب سے اچھا سمجھتے ہیں ؟"

"خدا نہ کرے جو میں ایسا سمجھوں ۔ البتہ میں اِس کو اِتنا بُرا اور گندہ بھی نہیں سمجھتا جتنا ہمارے سماج کی لمبی ناک والے سمجھتے ہیں ۔"

"آپ کیوں نہیں سمجھتے ؟"

"اِس طبقے کی عورت فاحشہ ہوتی ہے تو ہر وقت اور ہر طرح اپنے کو فاحشہ ظاہر کرتی ہے ۔ کبھی نیک پارسا نہیں بنتی ۔"

"بنے کیوں کر ؟ اُسے تو مال مارنے سے مطلب ہوتا ہے ۔"

"مگر وہ یہ تو ظاہر نہیں کرتی کہ اُسے مال مارنے سے مطلب نہیں ؛ 'رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا' تو نہیں کرتی ۔ وہ مال کے پیچھے عزّت، آبرو، نام، سب کچھ گنوا دیتی ہے ۔"

"بے ایمان بے ایمانی کیا کرے تو یہ خوبی ہو جائے گی ؟"
"اگر وہ کبھی بھی ایمان دار بننے یا نظر آنے کی کوشش نہ کرے تو ضرور خوبی ہو جائے گی۔"
"آپ دھن دولت پر ایمان دنیا عیب نہیں سمجھتے ؟"
"میں تو پرلے درجے کا عیب سمجھتا ہوں، مگر دنیا نہیں سمجھتی۔ یہ تو مال کے لیے گلھو کھاگلے کٹوا دیتی ہے اور دادا چاہتی ہے۔"
"جب ہی اچھے لوگ دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔"
"میں ایسوں کو کم ہمت اور بودا کہتا ہوں: دنیا سدھارنے کے بجائے دنیا چھوڑ دینا کم ظرفی ہے۔"
"دنیا چھوڑنے کو بھی آپ بُرا کہتے ہیں ؟"
"میں کیا ؟ ہر سدھارنے والا یہ ہی کہتا آیا ہے۔"
"کیا کہتا آیا ہے ؟"
"یہ کہ دنیا میں رہ کر دنیا بناؤ؛ چھوڑو یا بگاڑو نہیں !"
"ایسا ہو بھی سکتا ہے ؟"
"بے شک ہو سکتا ہے اور کرنے والے نے کر دکھایا ہے۔"
"آپ تو اوتار اور رشی نکال لائے۔"
"نہیں۔ میرا مطلب اوتاروں اور رشیوں سے نہیں۔"
"پھر کس سے ہے ؟"
"انسان کامل سے — وہ اوتاروں، نبیوں، رشیوں اور ولیوں

تک کی پول کھول دیتا ہے۔ وہ بشر کے قالب میں خدا نہیں بنتا۔ وہ اپنے آپ کو ہم تم سا بشر ہی بتاتا ہے۔ اور اس شان سے دُنیا میں رہ کر دُنیا کا بے نظیر موڈل بن جاتا ہے۔"

"آپ کہاں سے کہاں چلے گئے!"

"کہیں نہیں۔ میرا مطلب ظاہر و باطن کی یک سانی ہے۔"

"اور یہ بات آپ طوائفوں میں ہی پاتے ہیں؟"

"یہ میں نے کب کہا؟۔ البتہ یہ خوبی اُن کے پیشے کی جان ہے اور ہمارے سماج کا محض جسم۔"

"کچھ بھی ہو، فاحشہ تو فاحشہ ہی کہی جائے گی۔"

"اس میں کلام ہی کیا ہے؟۔ مگر چوٹی کی فاحشہ تو دُنیا ہے۔ یہ قحبہ پیدا ہوئی تو رعنا، لاکھوں برس رہی تو رعنا اور ہزاروں برس رہے گی تو رعنا۔ یہ اپنے البیلے لہو و لعب کی وہ وہ کینچلیاں بدلتی ہے کہ......"

روشنی ہو گئی اور سلیم کا فقرہ نامکمل رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ تاریکی کے مُردہ قالب میں روشنی کی رُوح ایک دم دوڑ گئی اور زندگی کی چہل پہل پلک جھپکانے میں وجود میں آ گئی۔

جگ موہن ناتھ کا ڈرائنگ روم، فرنیچر اور آرائش کے اعتبار سے، جیسا اُن کے والد نے چھوڑا تھا ویسا ہی اب تک تھا، جگ موہن ناتھ نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

ایک دوہرے گدّوں والا بڑا سوفا، دو اُسی کے ساتھ کی بغلی کی کشادہ اور گدّوں والی کرسیاں ایک وضع کی، اور دوسرا ایسا ہی تین عدد کا سٹ دوسری وضع کا، ڈرائنگ روم کی درمیانی سطح کو گھیرے ہوئے تھا۔ پہلے سٹ کے بازو بھی اسپرنگ اور گدّوں والے تھے مگر دوسرے سٹ کے بازو کا چار اُنگل چوڑا اور تکئے سے بیٹھک تک پہنچنے والا ساگون کا فریم ایک اور ہلکی چوبی چادر سے جڑا ہوا درمیانی خلا کو ڈھانکتا تھا۔ پہلے سٹ کا کل جسم اور دوسرے کے صرف پشت کے تکئے اور بیٹھکیں نیلے دھاریدار کپڑے سے منڈھی ہوئی تھیں۔ دروازوں کے پردے بھی نیلے تھے۔ جن کے صرف دونوں کناروں پر، تقریباً چار انگل چھوڑ کر، اُنگل اُنگل بھر چکلی تین سفید، سُرخ اور سبز پٹیاں تھیں۔ فرنیچر سے گھری ہوئی جگہ کے وسط میں ایک چوکنٹھی چھوٹی سی میز تھی جس کی بالائی سطح شیشے کی تھی سوفوں کے پہلوؤں پر کشمیری کھدائی کے کام والی شش پہل اور تہ ہونے

والی چوبی پائیاں تھیں۔ ان میں سے دو پر ڈال نٹ کی بڑی تشتریوں میں وال نٹ کے سگار دان رکھے ہوئے تھے۔ ایک خشخش وضع انگیٹھی، دو دو کش اور مَین ٹل پیس، دو دیواروں کے گوشے میں تعمیر تھے۔ زمین پر سیاہ و سفید ٹائلز کی شطرنجی بنی ہوئی تھی اور دو گز بلندی تک دیواریں بھی نیلے ٹائلز سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مَین ٹل پیس پر پیتل کے دو خوب صورت سارسوں کے درمیان کرشن جی کا مجسمہ بانسری بجا رہا تھا۔ دو دیواروں پر دو کھڑے ہوئے اور دو پھیلے ہوئے مستطیل چوکھٹوں میں نظر فریب مناظر کی رنگین نقاشیاں تھیں اور ایک دیوار پر قدِ آدم سنہری چوکھٹے میں، جگ موہن ناتھ کے پتا جی، کرسی پر بیٹھے، گھنی مونچھوں سے دہانہ چھپائے، صرف بڑی اور بھوری پتلیوں والی آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ یہ رنگین نقاشی جگ موہن ناتھ کی قلم کاری تھی، جو غالباً انہوں نے پتا جی کی تصویر سے بنائی تھی۔ اس کے نیچے ایک چیتا لکڑی کے تختے پر آگے جاتے جاتے، کروٹ کی طرف گردن پھیر کر، دانت نکوسے غرّانا چاہتا تھا۔

تمام فرنیچر چھٹا اچھا اور صاف تو ضرور تھا مگر سوفوں کے غلافوں، گدّوں اور دروازوں کے پردوں کا پھیکا رنگ اور چوبی حصّوں کا اُڑا ہُوا پالش بتا رہا تھا کہ ان میں کوئی ردّو بدل برسوں سے نہیں ہوا تھا اور جگ موہن ناتھ کو صفائی کے علاوہ فرنیچر سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتّہ ڈرائنگ روم کی مجموعی حالت سے ان کے پتا جی کے مذاق کا پتہ چلتا تھا جو غالباً نیلے رنگ کے دل دادہ ہونگے۔ شاید یہ کیفیّت جگ موہن ناتھ

کے تنہا اور نقاشی میں محو ہونے کا نتیجہ ہو۔

اتوار کو، دن کے دس بجے اکنزرد اور سلیم ڈرائنگ روم کی ڈوکرسیوں پر بیٹھے، سگرٹوں کو راکھ اور خیالات کو باتیں بنانے میں وقت گذار رہے تھے۔

"بے شک، تمہاری طرح میں بھی پہلے حسن کو فورم اور رنگ کا مجموعہ سمجھنے میں فورم کو جزوِ غالب سمجھتا تھا۔" کنزرو نے کہا۔

"مگر اب کیا آپ محض رنگ کو حسن سمجھتے ہیں؟"

"محض رنگ کو تو اب بھی نہیں سمجھتا، مگر عرصہ سے رنگ کو جزوِ غالب ضرور سمجھتا ہوں۔"

"گویا آپ ٹی شان کے مقلد ہو گئے۔ ریفائیل سے آپ نے گریز کی۔"

"میں کبھی بھی ان میں سے صرف ایک مقلد نہ تھا۔ میں تو ہمیشہ مائیکل اینجلو کو ترجیح دیتا تھا۔ البتہ اب میں رنگ والے نظریے کا بہت زیادہ قائل ہوں۔"

"اس میں شک نہیں کہ رنگ حسن کا نا قابلِ انکار جزو ہے، مگر پیکر پر تو حسن کا دارومدار ہے۔"

"میں اب اس کا قائل نہیں رہا۔ پیکر کی خوبی ضروری ہی، مگر رنگا رنگ

Michal Angelo [3] Raphael [2] Titian [1]

انحصار نظر آتا ہے۔ کیا بے عیب پیکر بدنما رنگ ہونے پر بھی حسن کا
نمونہ ہوتا ہے؟" کنٹررو نے سوال کیا۔

"اور کیا عمدہ سے عمدہ رنگ خراب پیکر کے ساتھ حسن کا نمونہ ہو سکتا
ہے؟" سلیم نے بھی اعتراضیہ سوال کیا۔

"نہ یہ ہو سکتا ہے، نہ وہ۔ البتہ پیکر کے چھوٹے چھوٹے یا معمولی
نقص انسان کی آنکھ اکثر نظر انداز کر دیتی ہے، مگر رنگ کا معمولی سا
عیب بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔"

"آخر پیکر کا وہ کونسا معمولی عیب ہے جو نظر انداز ہو جاتا ہے؟"

"مثلاً کانوں کا تناسب چہرے سے، پیشانی کا تناسب ٹھوڑی سے،
ہاتھوں کا تناسب جسم سے، انگلیوں کا تناسب ہتھیلی سے یا تلوے سے ...."

"ایسی باریک باتیں عام آنکھ نہیں دیکھتی، مگر آرٹسٹ تو اس کو بھی نظر انداز
نہیں کر سکتا۔"

"لیکن رنگ کا معمولی سا نقص تو عام آنکھ بھی نظر انداز نہیں کرتی۔"

"کیا یہ سمجھوں کہ آپ گورے رنگ سے کسی قدر گرا ہونا بھی رنگ کا عیب
سمجھتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں دراصل محض گورے رنگ کو ہی نظر فریب نہیں پاتا
بلکہ بعض سانولا رنگ ایسا بے عیب ہوتا ہے کہ عیب دار گورے رنگ کا
اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر تو میں نہیں سمجھا کہ آپ بے عیب رنگ کس کو کہتے ہیں۔"

"اُسے جو اپنی قسم کے لحاظ سے بے عیب ہو۔ کالا ہو یا گورا اگر عیب سے پاک ہو۔ کیا تم سفید رنگ ایک ہی قسم کا پاتے ہو؟"

"سفید رنگ ایک ہی سا نہیں ہوتا۔ ٹی شاں نے ایک شاہ کار میں چہرے کے سفید رنگ، کپڑے کے سفید رنگ، دانتوں کے سفید رنگ، آنکھوں کے ڈیلوں کے سفید رنگ، موتی کے سفید رنگ، بلکہ کپڑوں سے ڈھکے رہنے والے جسم کے سفید رنگ کا اختلاف نہایت خوبی سے نمایاں کیا ہے"

"یہ تو مختلف چیزوں یا جسم کے حصّوں کا مختلف سفید رنگ ہوا۔ مَیں تو انسان کے صرف چہرے یا ایک ہی حصۂ جسم کے لحاظ سے سفید رنگ میں اختلاف کی بات کہہ رہا ہوں۔"

"بے شک۔ گورا، سُرخ و سفید، بھبُوکا بھی سفید رنگ کے اختلافات ہیں۔"

"یہ بھی مشہورِ عام اور موٹی موٹی قسمیں ہوئیں۔ میں نے تو گذشتہ چھہ سال رنگ کے اختلافات کے مُشاہدے اور تحقیقات میں ہی گُذار دئے۔ اس وقت تک میں صرف گورے رنگ کی ایک درجن قسمیں معلوم کر سکا ہوں...."

"ایک درجن" حیرت کے ساتھ سلیم نے قطع کلام کیا۔"

"ہاں! ایک درجن، اور ابھی میرے خیال میں بے شمار قسمیں باقی ہیں۔"

"آپ اس کو عالم آشکارا کیوں نہیں کرتے؟"

"اس لیۓ کہ ابھی نہ تو وہ مکمل ہے اور نہ میں زبان ہی میں اس کے اظہار کے لیۓ الفاظ پاتا ہوں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ساخت اور نقشے کی طرح ہر فرد بشر کا رنگ بھی دوسرے سے جُدا گانہ ہوتا ہے۔"

"تحقیقات کی تکمیل کا انتظار کرنا تو غلط ہے۔ ایک نئے انکشاف کو دُنیا کے سامنے پیش کر دیے سے آپ کم سے کم آرٹسٹ دنیا میں تہلکہ ڈال دینگے۔ زبان کی کوتاہی کبھی کوئی خاص بات نہیں۔ ہر نئی تحقیقات کے اظہار کے لیۓ نئی اصطلاحات اور نئے الفاظ تراشتے جاتے ہیں...."

"کہتے تو صحیح ہو، مگر ابھی تم نے اس کام کا پُورا اندازہ نہیں کیا،" سگریٹ کا سُلگتا ہوا سرا راکھ دان میں ڈالتے ہوئے کنزروسے نے کہا "ہر ایک کا رنگ جُدا ہونے کی تائید میں، دنیا کے سامنے کم سے کم ایک رنگ کے ہی تمام مختلف اقسام تو پیش کرسکوں۔ اسی اعتبار سے میں نے چھ برس صرف سفید رنگ کے مشاہدے میں گذار دئے....."

"سفید رنگ کی تکمیل تک رُکنا فضول ہے۔ محض ایک درجن اقسام کا اظہار کافی ہوگا" سلیم نے قطع کلام کیا۔

"سفید رنگ کے ساتھ بنیادی سات رنگوں کو لیا جائے تو صرف ایک ایک رنگ کی گہری یا ہلکی آمیزش سے سفید رنگ کی ۱۲۸ قسمیں ہونی چاہئیں اور میں جب تک صرف ان ہی قسموں کا مشاہدہ انسانی جسم میں نہ کروں تو پیش کیا کروں...."

"گویا۔ ابھی پچیس برس کے قریب اور چاہیئے ہیں...."

"پچیس برس کیسے ؟" "مجھے تو ہندوستان میں ان کے پورا کر سکنے کی امید ہی نہیں۔ یہ خیال مجھے یورپ میں پیدا ہوا اور در اصل وہاں کے چار برس کے قیام میں گورے رنگ کی ۸ قسمیں تو وہیں معلوم کر چکا تھا۔"

"میری رائے میں آپ نے غلطی کی۔ اگر آپ ہندوستان میں کالے رنگ کے اقسام پہ تحقیقات کرتے تو غالباً آج تک ۱۲۸ قسمیں معلوم کر چکے ہوتے۔"

"بے شک! مگر اب تو چھ برس کی تحقیقات چھوڑ کر نیا راستہ نہیں لے سکتا۔"

"لیکن آپ کی چھ برس کی تحقیقات ہی دنیا کو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔"

"مگر میرا مقصد دنیا کو حیرت زدہ کرنا نہیں ۔ ایک مکمل چیز پیش کرنا ہے۔"

"معاف کیجئے آپ بہت خود رائے ہیں۔" بجا ہوا سگرٹ کھڑے ہو کر راکھ دان میں پھینکتے ہوئے سلیم نے کہا۔

"ہر سمجھ دار خود رائے ہوتا ہے۔"

"میں اور کوئی بحث چھیڑنی نہیں چاہتا" کنزروے نے ایک اور سگرٹ سلگا کر اور سگرٹ کیس سلیم کو دے کر کہا "رنگ کے متعلق مجھے ایک نیا تجربہ ابھی حال میں ہی ہوا ہے۔"

"وہ کیا ؟" سگرٹ سلگا کر سگرٹ کیس واپس کرتے ہوئے سلیم نے پوچھا۔

"ایک ہی رنگ پر مختلف قسم کی روشنی کا اثر۔"

"یہ تو کوئی نئی بات نہیں - رنگ تو روشنی پر ہی منحصر ہے۔"

"یہ پھر نہایت بودی سی بات ہوئی. معلوم ہے کہ رنگ کا دارومدار روشنی پر ہے - مگر یہ کہنا کہ مختلف روشنی میں رنگ مختلف نظر آتا ہے صحیح نہیں - کہنا یہ چاہیے کہ ہر قسم کی روشنی سے ایک ہی رنگ بدل جاتا ہے."

"بدلا ہوا نظر آنا یا بدل جانا ایک ہی بات ہے."

"ایک بات کس طرح ہے؟ نظر آنے سے تو یہ مطلب ہوا کہ وہ دراصل بدلتا نہیں."

"یہ بھی سہی، تو یہ صرف الفاظ و اصطلاح کی بحث ہوئی؛ نیا علم کیا ہوا؟"

"تم نے میری بات ہی کہاں سُنی؟ لفظی بحث کے ذمہ دار تم ہو."

"اب فرمائیے - میں لفظی بحث نہیں نکالونگا."

"سُرخ، سبز وغیرہ روشنی میں رنگ کا بدل جانا تو بہت پُرانا انکشاف ہے - بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ سُورج اور چاند کی روشنی میں بھی رنگ بدل جاتا ہے - مگر مجھے تو اب یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ ایک ہی آدمی کا رنگ دن ہی دن میں کمرے کے اندر، برانڈے میں، باغیچے میں، جنگل میں اور شاید ہر جگہ بدلتا رہتا ہے. یعنی اپنے گھر میں، دوست کے گھر میں، اور دُشمن کے گھر میں، وہی نہیں رہتا. اندرونی محسوسات اور بیرونی حالات میں بھی رنگ بدل جاتا ہے."

"بے شک! غصّے، صدمے اور مسرّت کے علاوہ کھُلے ہوئے منظر

یا پہاڑ پر بھی رنگ بدل جاتا ہے۔ مگر اِس تبدیلی کا تعلّق اِنسان کے چہرے سے ہی ہے۔"

"ہرگز نہیں! تمام جسم سے ہے۔ ہم چہرے کے سامنے رہنے سے اُسی کو دِل کا مظہر سمجھتے ہیں اور یہ صریح غلط فہمی ہے۔ جذباتی اور مقامی کیفیّت سے سارے جسم کا رنگ بدل جاتا ہے۔"

"آپ نے اس کا مشاہدہ کیا ہے؟"

"میں دماغی گدّے لگانے والا فِلاسفر نہیں جو کائنات کی گتھیوں کو محض عقل سے سُلجھانے کے بجائے اُلجھایا کروں - میں تو آرٹسٹ ہوں۔ مجھے تو ہر چیز دیکھنی چاہیئے۔"

"خوب! آخر یہ آپ کو سوجھی کیوں؟"

"اس کا جواب تو میں پھر دُونگا" کھڑے ہوتے ہوئے کنزر دے نے کہا "پہلے تم میرا ایک نیا قلم کار دیکھ لو۔"

"بڑے اِشتیاق کے ساتھ دیکھونگا - ضرور دکھایئے۔" کہتا ہوا سلیم بھی کھڑا ہو گیا۔

اسٹوڈیو سلیم کا بارہا دیکھا ہوا تھا۔ اندر گھُستے ہی اُس کی نظروں نے دیواروں پر وُہی درجنوں تصویریں پائیں جن کو وہ اچھّی طرح دیکھ چُکا تھا۔ مُورتی کے دونوں بڑے منقوش بھی اپنی جگہ پر لٹک رہے تھے، البتہ اونچی چوپائی کے سامنے، اڈّے پر ایک نیا قلم کار چڑھا ہوا تھا۔ سامنے پہنچتے ہی نظر آیا کہ مورتی کُرّۂ زمین پر عُریاں کھڑی تھی۔ بہین دوپٹّہ

سے حصۂ زیرِ ناف کا غیر معمولی طور پر یوں ہی سا چھپانا، پیکر کے ارادی اظہارِ عریانی کا اعلان تھا۔ سیدھے ہاتھ پر صراحی تھی اور الٹا ہاتھ جسم سے علیحدہ ہو کر سیاہ اور لہردار بالوں کے پس منظر میں اپنی اور پیکر کی جداگانہ دل فریبی کا نمونہ تھا۔ چہرہ بالوں کے اندر ابرِ سیاہ سے دفعتاً چمک نکلنے والے ماہِ کامل کی اصلاح تھا۔ دوپٹے کے دونوں پلّو دنیا پر پھیلے اور لٹکے ہوئے تھے۔ حُسن عورت کے قالب میں، عالم غیب ہو کر دُنیا کو اپنے پیروں تلے دبائے تھا۔ سلیم ابھی نظر سیر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ کُنزرو نے سامنے والی لمبی کھڑکی کا صرف ایک کواڑ کھولتے ہوئے کہا "اب دیکھو!"

سلیم نے دیکھا — بُت شاں کی طرح کُنزرو نے بھی صراحی، دوپٹے، کلائی، چہرے، آنکھ کے ڈھیلوں اور لباس سے چھپے رہنے والے جسم کی مختلف سفیدیوں کا امتیاز نہایت کامیابی کے ساتھ دکھایا تھا۔ کھڑکی کے کھلتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ روشنی کی مسیحائی سے بے جان میں جان آگئی اور مورتی دل ہی دل میں کچھ کہنے لگی۔ اُس کے نازک لبوں پر ہلکا سا بھی تبسّم نہ تھا: اُس کی آنکھوں میں خفیف سی بھی آرزو نہ تھی: اُس کی شبابِ ابروؤں میں برائے نام بھی کشیدگی نہ تھی: وہ بالکل ساکت ہونے پر بھی کچھ کہتی تھی — پیامِ محبّت؟ — نہیں — دل فریبیِ حُسن؟ — نہیں — قصۂ ماضی؟ — نہیں — اُمیدِ فردا؟ — نہیں پھر کیا؟ — صرف "آنکھ والو! میں ہوں!"

کُنزرو سلیم سے چند قدم دُور کھڑا، آرٹ اور آرٹسٹ کے عمل

اور ردّ عمل کا لطف لے رہا تھا۔ اُس کی نظر سلیم پر پڑی اور سلیم کی نظروں کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں مورتی تک جا پہنچی اور دیکھنا چاہتی تھی کہ سلیم نے کیا دیکھا؟ ــــ سب کچھ تو نہیں دیکھ لیا؟ ــــ آخر اُس نے پوچھا ــ "کہو! کیا دیکھا؟"

"جو جو کچھ آپ نے دکھایا ہے۔" سلیم نے جواب دیا، مگر نظر مورتی سے نہیں ہٹائی۔

"رنگ کا کرشمہ دیکھا؟"

"رنگ ہو یا پیکر، کرشمہ تو ہمیشہ دیکھتا ہوں۔"

"وہی اب بھی دیکھا؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا؟"

"اُستاد کا نیا کرشمہ۔"

"کیا اور قلم کاروں میں اُستادی نہیں دیکھی؟"

"اُستادی تو سب میں دیکھی" قلم کار سے نظر ہٹا کر کُنزرو کو تاڑتے ہوئے سلیم نے کہا "مگر اُستاد کو آج دیکھا!"

خُدکُشی کرتے ہوئے پکڑ جانے کی کیفیت کُنزرو کے چہرے پر دفعتاً نمایاں ہو گئی۔ جانبین کی نظریں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ اُس نے بڑھ کر سلیم کو لپٹا لیا اور کہا "بس نے بھر پایا۔"

"یہ انقلاب کب ہوا؟" سلیم نے پوچھا

" ہنومان دھارا پر۔"
" میری مذاق والی شرط سے؟"
" ہاں اُسی سے۔"

"اس ٹھنڈائی سے تو کچھ فائدہ معلوم ہوتا ہے" سرلا نے کہا۔
"ہاں! دھڑکن جاتی رہی ہے۔" راجکماری نے تسلیم کیا۔
"ابھی آپ کو حکیم جی کی دوا پیتے ہوئے دن ہی کے ہوئے ہیں؟"
"بیٹی! دو دن تو ہو چکے، آج تو تیسرے دن کی دوا بھی پی لی۔"
"دو ہی دن میں دھڑکن تو جاتی رہی؟"
"پر کمزوری تو بہت ہے۔ بھوک کا نام نہیں۔ دو دن سے سنترے کے رس کے سوائے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ تک نہیں گئی ہے۔"
"ہاں جی! کمزوری تو جاتے ہی جاتے جائیگی۔ آج پھلکے کا چھلکا دال کے پانی میں ڈبو کر کھائیے۔ حکیم جی ہتھیلی پر سرسوں تو نہیں جما سکتے۔"
"میں حکیم جی کو دوش نہیں دیتی! اُن کی ٹھنڈائی سے دل ہلنا رُک گیا اور دم میں دم آگیا؛ میں تو پہلے دن سمجھی تھی کہ اب پران نکلے جاتے ہیں۔"
"رام جی ایسا نہ کریں۔ آپ جگ جگ جئیں۔"
"کیا کہوں؟ پہلے دن جب میں چوکے میں پنڈت جی کو بھوجن پروستے پروستے گر ہی تو مجھے تو ہوش نہیں۔ ا......"

"آپ گریں کیسے؟ — پیر پھسلا؟" نرملا نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بیٹی! پیر وَیر نہیں پھسلا! پنڈت جی نے نیمبو کا اچار مانگا اور میں اچار کی گگھر پر سے اتار نے کھڑی ہوئی۔ پنجوں کے بل اچکی اور اچار کو چھوا ہی تھا کہ وہ میری چاند پر گری۔ میں سٹ پٹائی کہ دھک سے میرے کلیجے میں ایک گھونسا سا لگا اور میری آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا، کہاں گری اور کس نے مجھے اٹھا کر برآمدے میں پلنگ پہ ڈالا۔"

"آپ کے سر میں بہتیری چوٹ آئی۔"

"آئی ہو گی، مجھے پتہ نہیں، ڈاکٹر نے تو یہ ہی سمجھ کر دوا دی پر مجھے تو رتّی بھر آرام نہیں ملا۔ دن بھر چھاتی میں چھاج لگے ہوئے تھے سانس تک نہیں سماتی تھی۔"

"یہ ہی حالت میں نے شام کو لوٹ کر دیکھی تو میرے ہوش حواس بگڑنے لگے — ڈاکٹر صاحب آپ کے روگ کو اچھی طرح پہچان نہیں سکے۔"

"ہاں بیٹی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ حکیم کی دوا پہلے ہی دن کی جاتی تو میں اتنا ہلکان کیوں ہوتی؟ حکیم جی نے تو نبض پر ہاتھ دھرتے ہی کہہ دیا کہ چوٹ ووٹ کی بات نہیں ہے، دل کا دورہ پڑا ہے۔"

"اب تو ٹھنڈائی پیئے دو گھنٹے ہو چکے — ایک سنترہ اور کھا لیجیے!"

"مجھے کچھ بھوک نہیں ہے میرا من نہیں چاہتا۔"

"اس میں بھوک کی کون بات ہے؟" نرملا نے ایک سنگترہ پلنگ کے

سرہانے سے اٹھا کر کہا " میں چھیلے دیتی ہوں - آپ کھائیں نہیں تو پھانکوں کا رس ہی چوس لیں ۔"

" اچھا - دو پھانکیں دیدو - زیادہ نہیں ۔"

(دو پھانکیں چھیل کر دیتے ہوئے) " آپ چوسیں تو سہی - ہاں جی ! دوا سے زیادہ سنترے سے فائدہ ہوا ہے - حکیم جی نے تو انار کے دانے بھی بتائے تھے مگر آپ نے انار تو بہت ہی کم کھایا ۔"

" دو تین اناروں کے دانے چوس چکی ہوں اور سنترے تو درجن بھر سے بھی بڑھ گئے ہونگے ۔"

" یہ آپ اپنے کھاجے کی گنتی کیوں کیا کرتی ہیں ؟ "

" ارے بیٹی ! کھاجے کی گنتی نہیں ، داموں کی بات ہے ۔ ان تین دن میں اور کچھ نہیں تو ان چھ روپے کا میوہ چاب چکی ہوں - دوا اور حکیم ڈاکٹر کا خرچ الگ رہا ۔"

" یہ ایسا کونسا خزانہ ہے کہ دھکا لگ گیا ؟ "

" ہمارے پاس خزانہ کہاں - کم سے کم بیس پچیس کی چپت تو پڑ گئی - مرغی کو تکلے کا گھاؤ بھی بہت ہے ۔"

" آپ کا تن من ٹھیک رہے ، دھن تو ہر گھڑی پیدا ہو سکتا ہے ۔ آپ کے اوپر سے ہزار دو ہزار نچھاور بھی کر دئے جائیں تو کون سی بڑی بات ہو گی ؟ "

" ہاں بیٹی ! اب تم کہہ رہی ہو - ہزار دو ہزار تمھارے بھاؤ میں بھی نہیں ۔"

"آپ کے جیتے جی میں کون ؟"

"نہیں بیٹی! جس کی مایا اُس کی کایا۔ تم جُگ جُگ جیو اور اس دھن کو برتو اور بڑھاؤ۔ ہم بھی جیتے جی تمھیں پھلتا پھولتا دیکھیں گے تو باغ باغ رہینگے۔"

"دھن تو آپ کا ہی ہے۔ آپ ہی مالک ہیں۔"

"نہیں۔ یہ دھن تو سردار صاحب نے تم کو ہی دیا ہے۔ تمھارے ماتا پتا کو نہیں دیا ہے۔ ہماری اس میں ایک ادّھی بھی نہیں ہے۔"

"ہے تو سب کچھ ماتا پتا کے چرنوں کا گُن ؟"

"بھگوان جانے سردار میاں کو کیا ہوا ؟ تم نے جنم لیا کہ وہ تم پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جب تک ہم کان پور رہے وہ روز تمہیں دیکھنے آتے اور گھنٹوں اپنی گود میں لئے پھرتے۔"

"مجھ سے کیا واسطہ ؟ یہ تو آپ کے اور پتا جی کی وجہ سے تھا۔"

"یہ سچ ہے۔ اُن کے برابر سچا دوست تمہارے پتا جی کو جنم بھر نہیں ملیگا۔"

"پتا جی تو اپنا پکا دوست سدا انجم بابو کو سمجھتے رہے۔ سردار میاں کو وہ اُن کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔"

"بیٹی! مرنے پر آدمی کے گُن چمکتے ہیں۔ اُس وقت کھرا کھوٹا الگ ہو جاتا ہے۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ سردار میاں کے بیوی بچے نہیں تھے۔ مگر اُن کے

گئے رشتے میں تو بہتیرے بچے ہونگے۔ پھر انہوں نے اپنا دھن مجھے کیوں دیا؟"

"اس کا مجھے بھی اچنبھا ہے" راجکماری نے کروٹ لیتے ہوئے کہا

"اب تمہارے پتا جی آجائیں تو سب حال معلوم ہو۔"

"گاڑی کا وقت نکلے تو آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ شاید آج نہ آئیں۔"

"آج چوتھا دن ہے آج تک تو سب کچھ پتہ لگا چکے ہونگے۔"

"وہ تو نگم بابو کے پاس ہی ٹھہرے ہونگے۔ نگم بابو نے ہی سردار میاں کے مرنے کا اور مجھے اپنا دھن دینے کا تار دیا تھا......"

"ہاں! نگم بابو نے ہی تار دیا تھا" بات کاٹتے ہوئے کماری نے پھر سرلا کی طرف کروٹ لے لی۔

"تو نگم بابو سے قانونی مشورہ تو پتا جی نے پہلے ہی دن کر لیا ہوگا۔"

"اور کیا۔"

"اب تو شاید سردار میاں کے کنبے والوں سے بات چیت میں دیر لگی ہو گی۔"

"بات چیت کاہے کی؟ ۔ جب انہوں نے تم کو گود لے لیا تو جھگڑا ہی نہیں رہا۔"

"کیا میرے گود لینے کی رسم ہوئی تھی؟"

"یہ کیسے ہوتی؟ وہ تو مسلمان تھے۔ پر اب تو انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہوگا کہ میں نے گود لے لیا تھا۔"

"سلیم تو مجھ سے کہتے تھے کہ مسلمانوں میں گود لینا نہیں ہوتا اور کسی باہر

والے کو مرنے کے بعد مال ملنے کی وصیت کی بجائے تو اُس کو پورا مال نہیں ملتا۔"

"پھر کتنا ملتا ہے؟"

"اُن کا کہنا ہے کہ وارثوں کے سامنے باہر والے کو تہائی سے زیادہ نہیں ملتا۔"

"انھوں نے تو اپنا سب دھن تم کو ہی دیا، آپ دنیا والے تو لینے دیں تو اور بات ہے۔"

"یہ تو آپ سچ کہتی ہیں — مجھے تو جیسے پھر اُن ہی کا گُن ماننا چاہئے۔"

"ہاں بیٹی! تم نے کوٹھیاں بھی دیکھیں؟ پنڈت جی تم سے چلتے چلتے ایک کوٹھی پسند کرنے کو کہہ گئے تھے۔" کماری نے بات چیت کا رُخ بدلا۔

"جی ہاں میں نے سلیم کے ساتھ کئی کوٹھیاں دیکھیں۔ اُن میں سے ایک تو کشمیری دروازے پر ہے اور بڑی کوٹھی ہے۔ دوسری قرول باغ میں ہے وہ چھوٹی ہے۔ کشمیری دروازے والی باوٹے کے پاس ہے اور وہ مجھے دونوں میں اچھی معلوم ہوتی ہے اگر اُس کی قیمت بہت ہے۔"

"کتنے داموں کی ہے؟"

"اُس کا مالک ستر ہزار مانگتا ہے اور کوڑی کم نہیں کریگا۔"

"اور دوسری کے کیا دام ہیں؟"

"اُس کے چالیس ہزار مانگتا ہے اور اس میں کچھ کمی بھی ہو جائیگی۔"

"دونوں کوٹھیاں ایک ہی کی ہیں؟"

"نہیں۔ باوٹے والی ایک پنجابی کی ہے جس کی موزے بنیان کی دکان چاندنی چوک میں ہے اور قرول باغ کی ایک جین کی ہے جو وکیل ہیں۔ پیپل جہاز یو کی گلی میں رہتے ہیں۔"

"تم نے تو سب باتیں معلوم کر لیں....."

"میں کیا معلوم کرتی؟ سلیم نے دو دلالوں سے کہا اور انہوں نے ہی سب پتہ لگایا، میں تو ان کے ساتھ دونوں کوٹھیاں دیکھنے گئی ایک پسند آئی۔"

"تو پھر پنڈت جی کے واپس آنے پر جون سی تم نے پسند کی ہے وہی لے لینا۔"

"اس کی قیمت بہت ہے۔"

"ہونے دو۔ اب تو رام جی کی دیا سے تم مال دار ہو......"

"مگر ابھی کیا معلوم مجھے کتنا ملے۔" سرلا نے بات کاٹی۔

"سردار ہیاں تو لکھ پتی تھے۔ تم کو کچھ نہ ملے تو بھی ایک لاکھ تو کہیں گیا نہیں۔"

"ایک لاکھ میں سے ستر ہزار کوٹھی کا گیا تو تیس ہزار ہی میرے پاس بچے۔ اس میں ننگی کیا نہائیگی اور کیا نچوڑے گی۔"

"ہاں بیٹی! جب منہہ میں چاول ہوتے ہیں تو آدمی چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ اب بھلا تیس ہزار تمہارے خطرے میں کیوں آنے لگے؟ تم نے سلیم صاحب سے بھی رائے لی؟"

"وہ تو کہتے ہیں کہ چھوٹی کوٹھی اچھی خاصی ہے۔ ساٹھ ہزار بچ رہیں تو پچاس ہزار کے دار پونڈ لے لوں اور دس ہزار میں کوٹھی کا سامان اور موٹر خرید لوں۔ یوں سوا سو ڈیڑھ سو مہینے کی آمدنی بھی ہو جائیگی۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اُن کی رائے ہر بات میں صحیح ہوتی ہے۔ بچارے پہلے دن شام سے آئے اور آدھی رات تک میری بچّی کے پاس بیٹھے رہے۔ اُن ہی کی رائے سے علاج بدلا گیا اور وہی دوسرے دن حکیم جی کو لائے۔"

"جی ہاں! پتا جی تو حکیم صاحب کو جانتے بھی نہیں تھے۔"

"سلیم صاحب بڑے بھلے مانس ہیں۔ صورت شکل بڑی پیاری اور چال چلن بڑا اچھا۔ دھرم کا سوال نہ ہوتا تو تمہاری....."

"ماں جی! صورت اور عادت کو دھرم سے کیا تعلق؟" سرلا نے جان بوجھ کر بات کاٹی۔

"نہیں۔ یہ خیال ٹھیک نہیں۔ دھرم سے ہی آدمی کے کرم ٹھیک رہتے ہیں۔"

"کیا مسلمانوں میں اچھے کرم نہیں ہوتے؟"

"سب سے بڑا کرم تو دھرم ہے۔"

"دھرم کو چھوڑ کر اور کرموں کا ذکر ہے۔"

"یوں تو ہر ہاتھ کی پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ مسلمانوں میں بھی بھلے مانس اور اچھے لوگ ہوتے ہیں۔"

"یہ ہی تو میں بھی کہتی تھی کہ بھلا مانس وُہی ہے جس کے کرم اچھے ہوں۔ اس سے دھرم سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ۔"

"پر مسلمان تو ایسا نہیں مانتے۔ وُہ تو ہم کو کافر کہتے ہیں۔"

"نہیں تو۔ مسلمان تو کہتے ہیں ہمارا دین ہمارا اور تمہارا دین تمہارا، ہم اپنے راستے پر تم اپنے راستے پر......."

"یہ سلیم نے کہا ہوگا؟ وُہ بھی تم کو پھسلانے کے لئے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔"

"ہمارے ہاں کیا ہے؟ ہم بھی تو مسلمان کو ملکش سمجھتے ہیں۔ اُس کے ہاتھ کا چھوا پانی پینے کے روادار نہیں: وُہ تو ہمارے ہاتھ سے پانی تک پی لیتا ہے۔"

"اسی سے تو ظاہر ہے کہ ہم اُس سے پوتر ہیں۔ ہم اُس سے اونچے ہیں۔ نہیں تو وُہ ہمارے ہاتھ کا پانی کیوں پیتا۔"

"ماں جی! آپ بُرا نہ مانیں۔ یہ تو کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ اِس چھوت چھات نے تو ہمارے دھرم والوں کو بھی اچھوت بنا رکھا ہے۔"

"بنانے کی بات نہیں۔ ہر شے تو اسی رنگ میں رچائی ہے۔ برہمن تو خاص برہما کی اولاد ہے، وُہ سب سے اونچا ہے۔ یہ تو سوچو کہ ذات پات ہمارے دھرم کا حصہ ہے کہ نہیں؟"

"میں تو اِس کو دھرم کا حصّہ نہیں سمجھتی - آدمی آدمی سب برابر..."

"یہ غلط ہے - ہمارے دھرم کے خلاف ہے - جب بیل گھوڑے اور جانوروں تک میں نسل اور خون کا اثر ہوتا ہے تو آدمی میں کیسے نہیں ہوگا ؟"

"بے شک - یہ دلیل ٹھیک معلوم ہوتی ہے - خون کا اثر ضرور ہونا چاہیئے ؟ مگر اس سے کرم تو نہیں بدل سکتے ."

"ہاں - کرم پر خون کا اثر نہیں ہوتا ."

"تو پھر مسلمانوں میں جن کے کرم اچھے ہوں اُن کو......"

"مسلمان تو اپنے اچھے کرم مسلمانوں کے ساتھ ہی رکھتا ہے" کماری نے بات کاٹتے ہوئے کہا "ہمارے ساتھ بھلائی کرنی نہیں چاہتا ."

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟" سرلا نے حیرت کے ساتھ پوچھا "مجھے دھن کس نے دیا ؟ سردار میاں مسلمان تھے اور میں ہندو."

"یہ تو فقط رام جی کی دیا ہے - تم پر دیا کرنی تھی ، چاہے جس سے دلا دیا ."

"یہ ہی تھا تو کسی ہندو سے کیوں نہ دِلایا ؟"

"بیٹی تو تو پڑھ لکھ کر بڑی جھگی ہو گئی ہے" کہتے ہوئے کماری نے پھر دوسری طرف کروٹ لے لی ."

"ہاں ! ایک اور بات یاد آئی ."

"کیا؟"

"سردار میاں کی جو تصویر کارنس پر رکھی رہتی تھی وہ کل سے نظر نہیں آرہی — کہاں گئی؟"

"پرسوں شام کو کسی نے اُس کو گرا دیا۔ اُس کا شیشہ اور چوکھٹا ٹوٹ گیا۔"

"تصویر تو نہیں ٹوٹی ہو گی؟"

"نہیں۔ تصویر تو نہیں ٹوٹی۔"

"پھر وہ گئی کہاں؟"

"میں نے اُٹھا کر کہیں رکھ دی۔ یاد نہیں کہاں رکھی۔"

"مجھے تو کہیں ملی نہیں۔"

رشنی ان سُنی کرتے ہوئے، "اب تو مجھے نیند آرہی ہے۔"

"سو جائیے! آپ کے لئے آرام کرنا ضروری ہے۔"

"تم اب کیا کرو گی؟"

"میں باہر جا رہی ہوں۔ پتا جی تو آئے نہیں — اب تو وہ کل آئیں گے۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"وہی کوٹھی کا معاملہ کرنے۔ دیکھو، دلالوں نے کیا کوشش کی۔"

"وہ تو سلیم سے معلوم ہو جائے گا۔ وہ شام کو آئیں گے۔"

"مجھے زنجیر بھی تو دیکھنا ہے اور بہت سامان لینا ہے۔"

"تم اکیلی تو پھرنا نہیں — سلیم کو ساتھ لے لینا۔"

"ہاں! اُن ہی کے ساتھ جاؤں گی۔"

❊❊❊
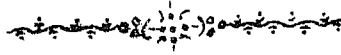
جگت نرائن شرما پانچ روز میں کانپور سے پلٹے تو معلوم ہوا:

سردار خاں مرحوم نے بارہ لاکھ نقد اور چھ لاکھ مالیت کی جائیداد چھوڑی۔ وارثوں میں اُن کے پانچ سگے بھتیجے تھے اور وصیت کی رُو سے سرلا تھی۔ وصیت نامہ صاف اور رجسٹری شدہ تھا جو مرنے سے صرف ایک ہفتہ پیشتر نگم صاحب کے مشورے سے لکھا گیا، رجسٹری ہوا اور اُن ہی کے پاس رہا۔ مرحوم نے نو لاکھ نقد سرلا کو بیٹی کے طور پر وصیت کئے تھے۔ لاش پر گدھوں کا جمع ہونا اور مرنے پر وارثوں کی دو دو چونچیں ہونی ضروری ہیں اور تقریباً ہمیشہ ہوتی ہیں۔ شریعت ہی کی بنیاد پر نگم صاحب کچھ اور سمجھے تھے اور بھتیجے کچھ اور۔ نگم صاحب کی رائے میں، اگر پورے نو لاکھ سرلا کو نہ مل سکیں، تو بھی ۱۸ لاکھ کے ترکے میں سے چھ لاکھ پر وصیت کا نفاذ ہوتا تھا؛ مگر بھتیجوں کے وکیل مسٹر قدیر کی رائے میں نو لاکھ کی تہائی اگر جائز نہ سمجھی جائے، تو بھی چار لاکھ سے زائد سرلا نہیں پاسکتی تھی، کیونکہ نقد ترکہ بارہ لاکھ تھا اور جائیداد کی مالیت اس میں شامل نہیں کی جاسکتی تھی۔ گویا، ایک صورت سے چھ لاکھ اور دوسری سے چار لاکھ سرلا کا حصہ تھا۔

اس علم کے ہوتے ہی :

کشمیری دروازے کی کوٹھی اس طرح خرید لی گئی کہ فی الحال ڈیڑھ سو روپے ماہوار کرایہ دیا جائے اور ستر ہزار قیمت ادا کرنے پر بیع نامہ رجسٹری کرا لیا جائے ۔ کل فرنیچر اور سامانِ آرائش بھی کھڑے کھڑے منہ مانگے داموں اور اس شرط پر لیا گیا کہ قیمت کی ادائیگی تک اس کا ماہوار کرایہ استعمال جو سب ملا کر سو روپے مہینے کے لگ بھگ ہوتا تھا ادا کیا جائے ۔ موٹر کے دام البتہ شر غاجی نے پراویڈنٹ فنڈ والی رقم سے نقد ادا کئے ۔ ایک باورچی، ایک مالی، ایک چوکیدار اور ایک ڈرائیور بھی ملازم رکھ لئے گئے ۔ اس کوٹھی میں منتقل ہونے اور آرام کے ساتھ بس جانے میں ایک ہفتہ لگ گیا ۔ اسی عرصے میں شر غاجی نے سرلا کا فطری ولی ہونے پر دہلی کے جج سے، ولایت کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا اور دلی کے وکلا سے مشورہ بھی کر لیا ۔

اس انتظام کے بعد ہی :

کیل کانٹے سے لیس ہو کر، شر غاجی پھر کانپور روانہ ہو گئے ۔ وہاں ایک نیا شگوفہ کھلا : اب بھتیجے ایک حبہ بھی سرلا کو دینا نہیں چاہتے ۔ وہ کہتے تھے کہ وصیت نامہ فرضی ہے جو مرحوم سے مرض موت کی بے حواسی کے عالم میں رنگم سے نے رجسٹرار کے سامنے تسلیم کرا کر رجسٹری کرا لیا ۔ مقدمہ بازی لازمی ہو گئی اور دونوں طرف سے

قانونی بال کی کھال نکالی جانے لگی۔ وکالت کا بازار گرم ہوگیا اور قانون پیشہ کے حلوے مانڈے کا سامان ہوگیا۔ معمولی سے معمولی وکیل بھی شیطان سے بہت اونچی ہستی ہے: شیطان اور وکیل اپنے راستے پر چلانے میں برابر کے ماہر فن؛ مگر شیطان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا اور وکیل کپڑے اتار لینے تک بھی پلّو نہیں چھوڑتا؛ شیطان کے گھر نہ در اور وکیل کے گھر ہی گھر؛ شیطان کا منہ کالا اور وکیل کا بول بالا۔ فاحشہ بھی ایک وقت میں ایک ہی کی حجامت بنا لیتی ہے، مگر وکیل ایک وقت میں درجنوں کا سر مونڈتا ہے۔ فاحشہ کی کمائی حرام، زمیندار کی آمدنی پاپ، مگر وکیل کا خون چوسنا حلال بلکہ ثواب۔ وکیل فاحشہ پیشگی میں اونچی سے اونچی قحبہ کے نیچے نظر آتا ہے یا اوپر؟

کورٹ فیس، اسٹامپ اور محنتانے نے شرفا جی کی تھیلیاں پہلے ہی دن خالی کرالیں۔ بیچارے نے تنہائی میں پلنگ پر دراز ہو کر سوچا تو بھی کورٹ فیس اور اسٹامپ کی خوبی اس کے سمجھ میں نہ آئی۔ اگر عدالت کے وقت کے دام ہوں تو وقت کے لحاظ سے لئے جائیں؛ مالیت سے کیا مطلب؟ اکثر کم مالیت کا جھگڑا جتنا وقت لیتا ہے، زیادہ مالیت کا اس سے آدھا بھی نہیں لیتا۔ وہ تو ٹکے لے کر نیا ذکر نا مغربی ٹکے ہائی پن سمجھتے تھے۔ البتہ نگم بابو نے محنتانہ لینے سے اوّل دفعہ ہی انکار کر دیا تھا۔ مگر اس اتفاق کا بُرا ہو کہ آپ سردار خاں کے ہوش و حواس صحیح ثابت کرنے کے لئے نگم بابو ہی گواہ کی صورت میں پیش کئے

جا سکتے تھے۔ مرحوم کے کنبے والوں میں سے کسی کا گواہی دینا تو کیا انہوں نے تو اس مقدمہ بازی کو بھی اس درجہ ہندو مسلم سوال بنا دیا تھا کہ اول دن سے سول جج کی بات بات پر انتقالِ مقدمہ کے لئے تُل جاتے تھے۔ شاید ایک شخص کے انتقال سے متعدد داغوں کا انتقال ہو گیا۔ لیکن امید کا سبز باغ پھر بھی اُجڑنے والوں کو ساون کا اندھا بنائے تھا۔

دلی میں، سرلا کو نئی کوٹھی کا اور شری متی کماری کو نئے بستر کا لطف اٹھاتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ دن کے بعد رات آتی تھی اور رات کے بعد دن جاتا تھا: سانس آتا اور جاتا تھا: دنیا سوتی تھی اور حال ماضی ہوا جاتا تھا!

ایک ہفتہ بعد مقدمہ دائر ہو جانے کا خط آیا۔ دوسرے ہفتے میں مرحوم کی کٹی بابا پر سرکاری سانپ بٹھا دئے جانے کی اطلاع ملی۔ تیسرے ہفتے میں بڑی بی نے کچھ آنکھیں کھلنی شروع کیں اور چوتھا ہفتہ لگتے ہی تو دیدے کھول دیتے اور لگیں چھت کو گھورنے۔ شرغا جی چلتے چلاتے دو سو روپے پکڑا گئے تھے اور کم سے کم چار لاکھ مہینہ بھر میں مل جانے کا یقین دلا گئے تھے۔ مگر اب؟ — مہینہ ختم ہونے پر؟ — پٹرول کا بل، بجلی کا بل، کپڑوں کی دھلائی، نوکروں کی تنخواہ، سودے سلف کی اُچاپت اور کوٹھی و سامان کے کرائے کا گچھا: بڑی بی کو دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ کبھی بولا کر سرلا سے پوچھا کہ "اب کیسے چلے گی؟" تو اس نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ "ماں جی! آپ تو بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو ایک نہ ایک روگ لگائے رہتی ہیں۔ ہوگا کیا؟ — اس مہینے میں نہیں تو دوسرے

میں دے دیا جائے گا۔ کوئی ہم بھاگے جاتے ہیں یا غدر پڑ رہا ہے؟"
بڑی بی کو تسلّی کیا خاک ہوئی، وہ چپ ضرور سادھ گئیں۔ وہ تو سوچتیں، ٹھنڈے سانس بھرتیں اور دل ہی دل میں کہتیں "ہائے ست جگ! ہائے رام راج!"

لازمی تھا کہ غیر متوقّع تغیّر سے نوخیز دل و دماغ پر زیادہ اثر ہوتا؛ سرلا نے اپنا ترکہ کم سے کم چار لاکھ سمجھ لینے پر سب سے پہلے ریڈیو گھر پر لات ماری اور ملازمت چھوڑ دی؛ پھر سوسائٹی کا لطف ایک حد تک حاصل کرنا شروع کر دیا۔ حسن، شباب اور تموّل کی یک جائی! باپ، بیٹے اور روح القدس کے اجتماع سے کم نہیں! سرلا سماج کی نوخیز بے جانوں میں جان ڈالنے لگی۔ اس کی مسیحائی کا حلقہ، خودداری کی وجہ سے محدود ہوا مگر پھر بھی سلیم کی تنہا ذات سے متجاوز ہو گیا تھا۔ سرلا کی خواہش خودنمائی تو اس کا باعث تھی ہی، مگر سلیم کی خفیف سی کنارہ کشی بھی اس کی ذمہ دار تھی۔ سلیم اس انقلاب مرتبہ سے کھینچنے کے بدلے کھنچنے لگا تھا۔ وہ پہلے تو سرلا کا بے خرید غلام تھا، پھر بڑی بی کے علاج معالجے میں دن میں دو چکر لگاتا رہا، اور اب کشمیری دروازے کی سکونت کے بعد سے کئی کئی دن نظر نہ آتا تھا۔

ممکن نہ تھا کہ سرلا اس کو محسوس نہ کرتی اور محسوس کرنے پر اس کے سمجھنے کی کوشش نہ کرتی۔ مانا کہ نئی کوٹھی کا فاصلہ، دریا گنج کے بہ نسبت، مٹیا محل سے زیادہ تھا؛ مگر نہ اس قدر کہ دن میں ایک دفعہ آنا بھی دشوار

ہو جاتا۔ ریڈیو گھر کا ساتھ چھوٹ جانے پر تو شوقِ ملاقات بڑھنا چاہیئے تھا، دبی ہوئی چنگاری بھڑکنی چاہیئے تھی اب بھی آمنا سامنا ہوتے ہی، سرلا کی نظریں سلیم کی آنکھوں سے اُس کے دل کی خانہ تلاشی لیتیں تو سلیم کی گردیدگی میں تنکے کا پَل بھی نہ معلوم ہوتا۔ پھر اِس کھچاؤ کہ تہ میں کیا تھا؟ ہو نہ ہو خُدداری تھی۔ مگر سرلا سے خُدداری ہی ہے۔ سرلا سے نہیں، سرلا کے توسّل سے۔ وُہ اِس حجاب کو ناجائز اور بے بُنیاد ہی نہیں، ناگوار بھی سمجھتی تھی۔

آج پتاجی کے خط سے نئی اطّلاع ملنے پر، سرلا نے شام کو سلیم کے ہاں خُد جا کر مشورہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ بھی تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ سلیم کی بے رُخی کو صاف صاف معلوم بھی کرے۔ چار بجے اُس نے ماں جی کے پلنگ کے برابر رکھی ہوئی چھوٹی میز پہ رنگترے، سیب اور انار ایک تشتری میں آہستہ سے رکھ دئے اور دبے پاؤں چلی آئی کہ اُن کی نیند میں فرق نہ پڑے۔ پھر، کھانے کے کمرے میں اُس نے چائے مانگ لی۔ باورچی چائے پوشی سے ڈھکی ہوئی چائے دانی، دو توس، مکھن دانی، دُودھ دان، شکر دان اور ایک چھُری، لکڑی کے ٹرے پر لایا اور کھانے کی میز پہ لگا گیا۔ اسی عرصے میں سرلا نے ہوا خوری کے لیئے، آسمانی ریشمیں اور چمکیلے کنارے دار ساڑھی باندھی، بالوں میں کنگھے سے خاطر خواہ کیفیت پیدا کی اور نکھ سے سکھ تک اپنے سراپا کا آئینے میں جائزہ لیا۔ سُنہری بالوں کے چند چھلّے گندمی پیشانی

کے دونوں جانب اُلٹی علامت سوالیہ بن کر بتا رہے تھے کہ سوال کا اُلٹا جواب زیادہ دلفریب ہوتا ہے۔ آنکھیں بادامی اور پپوٹے غلافی: ناک ستواں ہوتے ہوتے بانول بھر رہ گئی تھی: سفید ڈھیلوں میں بھوری پتلیاں چمک رہی تھیں اور کشادہ دہانہ کسی قدر بھاری لبوں سے بند تھا۔ نظری دلجمعی کے بعد وہ کپڑوں والے کمرے سے کھانے کے کمرے میں آ گئی۔ چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے اُس نے موٹر کی تیاری کا حکم دیا اور باورچی شوفر کو اطلاع کرنے باہر گیا۔ ابھی اُس نے آدھی پیالی پی تھی اور ایک توس مکھن لگا کر کھایا تھا کہ برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ اس سے پیشتر کہ مرلا کچھ کہتی، مسٹر کھچلو پردہ ہٹا کر "کیا میں آ سکتا ہوں؟" کہتے ہوئے اندر تھے۔

"بے شک،" کہے ہوا تھے مرلا کہتی ہی کیا؟

"میں چائے میں مخل تو نہیں ہوا؟" کہتے ہوئے کھچلو ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بالکل نہیں۔" مرلا نے کہا "آپ بھی چائے پی جیے۔"

"شکریہ۔ میں ابھی پی کر آ رہا ہوں۔"

"ایک پیالی اور سہی؟"

"نہیں۔ گنجائش نہیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"ذرا نہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان تکلّف کیسا — میں تو اس

گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔" سرلا دوسرے توس پر مکھن لگاتی رہی اور کچھ نہ بولی۔

"آپ نے ریڈیو سے قطع تعلق کر لیا اس لئے میں نے کبھی آپ ریڈیو پر بولنے سے انکار کر دیا۔" رکھلو نے کہا۔

"یہ کیوں؟" سرلا نے چائے کا گھونٹ پی کر پوچھا "مجھے تو اب ریڈیو سے تعلق کی ضرورت نہیں رہی۔"

"مجھے تو کبھی بھی ضرورت نہیں تھی - میں تو صرف شوقیہ بولتا تھا۔"

"پھر تو آپ کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"میں ان ریڈیو کے لونڈوں کی بے جا اصلاح برداشت نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اس کا علم نہیں۔"

"آپ کو اس سے تعلق نہیں تھا۔ یہ پنجابی ڈھنگے اردو کیا جانیں؟ - کوئی جملہ اگر ریڈیو کی پالیسی کے خلاف ہو تو اس کے کاٹ دئے جانے پر اعتراض نہیں - مگر یہ تو زبان میں اصلاح فرماتے ہیں - ریڈیو گھر میں پہنچتے ہی، شاعر، زباں داں، ادیب اور سب کچھ بن جاتے ہیں۔"

"اگر ایسا کیا جاتا ہے تو واقعی بہت نامناسب ہے۔"

"اسی قدر نہیں - اس سے بھی بڑھ کر - ایک استعارے کی حجامت بناتے ہیں، ایک تشبیہ کا کھوج لگاتے ہیں - طنز و مزاح سمجھتے سمجھاتے تو خاک نہیں مگر ٹانگ لڑانے کو تیار - ابھی ان لونڈوں کو برسوں زبان

سیکھنی چاہیئے مگر وہ تو اپنے آپ کو ایسا اونچا ادیب سمجھتے ہیں کہ ٹنگڑی تلے سے فیضی و عرفی نکل چکے۔"

"آپ تو بہت عرصے سے ریڈیو پر تقریر کرتے ہیں؟"

"کوئی ڈیڑھ سال سے۔"

"پھر آپ نے آج تک یہ بات کیوں برداشت کی؟"

"میں تو اوّل دن سے اس پر اعتراض کر رہا ہوں۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر سے پروگرام ڈائرکٹر تک۔ بلکہ اُن کے گرد گھنٹال تک۔ سب ایک سے ہی ہیں۔ آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اِس بدتمیزی کے علاوہ بے عزتی بھی کی جاتی ہے۔"

"بے عزتی سے کیا مطلب؟"

"یہ کہ گانے والوں کو، خصوصاً طوائفوں کو۔ آرٹسٹ کا لقب دے کر۔ دس دس منٹ کے پچاس پچاس اور سو سو روپے دیئے جاتے ہیں اور ادیب و شاعر کا پاؤ گھنٹے کا معاوضہ بیس اور پچیس روپے ہے۔"

"اِس کی وجہ تو یہ ہے کہ شاعر و ادیب اِن داموں پر اعتراض نہیں کرتے اور گانے والے کوڑی کم لینے کو تیار نہیں۔"

"بے شک! اعتراض کرنا تو کیسا، یہ چند روپلی سر آنکھوں پر رکھ کر لیتے ہیں، احسان مانتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں۔"

"پھر ریڈیو والوں کی کیا خطا؟"

"کیا خطا ؟ — گدھے اور گھوڑے کو ایک لکڑی سے ہانکنا۔ جو لوگ ریڈیو کا رویہ برداشت کرتے ہیں وہ دو قسم کے۔ حاجت مند یا شہرت طلب — شہرت طلب یونی ورسٹیوں کے نونہال ہیں یا روزانہ کا درس رٹانے والے پروفیسر۔ اِن لوگوں نے ادب کی بھی نا قدری کرا دی ہے۔"

"آپ جیسے ادیب کو تو ریڈیو کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہیئے — سال ڈیڑھ سال تک برداشت کر لینا بھی بہت ہُوا۔"

"ایک مرتبہ جال میں پھنس جانے کے بعد کچھ عرصہ پھڑ پھڑانے میں لگ ہی جاتا ہے۔"

"آخر اس وقت چھوڑنے کی کیا خاص وجہ ہُوئی ؟" سرلا نے چائے ختم کر کے پیالی ہٹاتے ہُوئے پُوچھا۔

"اِس وقت تو صرف آپ کا قطعِ تعلق اس کا باعث ہُوا۔"

"یہ کیوں ؟"

"اِس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔"

سرلا اِن کی اچانک آمد سے ہی جز بز تھی — اب تو وہ بوریا بستر بھی معلوم ہونے لگے۔ وہ کرسی کھسکاتے ہوئی میز سے ہٹ بیٹھی۔

"کیا آپ کہیں جانے والی ہیں ؟"

"ہاں! میں روز شام کو ہوا خوری کے لئے چلی جاتی ہوں۔"

"اگر اعتراض نہ ہو تو میں بھی چلوں ؟"

"مجھے ایک ضروری کام بھی ہے — ورنہ آپ شوق سے چلتے۔"

آخر سرلا کھڑی ہو گئی اور کچلو بھی اُٹھ کھڑے ہوئے، ساتھ ساتھ باہر گئے اور اُس وقت تک سرلا کا سایہ بنے رہے جب تک موٹر سرکنے نہ لگی ہو۔ "قدسیہ باغ کی سڑک، کشمیری دروازہ، بازار، بڑا ڈاک خانہ،" سرلا کو دکھائی دیتے تھے مگر دیکھتی نہ تھی۔ وہ کچلو جیسے بچے چھاڑ کر پیچھے پڑنے والوں کی عادت، طریقے اور بے حیائی کو دیکھتی رہی کہ پل کے دروازے کے نیچے سے نکلتے ہی، کوڑیا پل والی سڑک کے چوراہے پر، سپاہی کے ہاتھ نے ایک منٹ کے لئے موٹر کو روکا اور اب سرلا ہر چیز دیکھنے لگی۔ ٹھنڈی سڑک سے موٹر سیدھے ہاتھ کو مڑی، جامع مسجد پہنچی اور اُس کا تہائی طواف کرتی مٹیا محل کے بازار میں مڑ گئی۔ موٹر کے رُکتے ہی سرلا اُتری، مٹیا محل کے محلّے میں کچھ دور پیدل چل کر سلیم کے دروازہ میں ٹھٹکی اور اندر داخل ہو گئی۔

پہلے وسیع صحن کے سامنے دو سیڑھی اونچا چبوترہ اور اُس پر پُرانی وضع کا پانچ در کا مکینہ دالان در دالان؛ اندر کے دالان میں خشخش نما کواڑوں کی جوڑیاں پُرانی عمارت میں نئی اصلاح کا اعلان؛ باہر والے دالان کے سیدھے رُخ دو در، لکڑی کے چوکھٹے میں کپڑا لگا کر ایک کمرہ بنا دیئے گئے تھے جو سلیم کا اسٹوڈیو تھا، بقیہ دالان میں چند کرسیاں اور ایک میز نظر آتی تھی۔ اِس وقت سلیم ایک بینڈک والی آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور چند بینڈ کی کرسیاں اُس کے سامنے چبوترے پر حلقہ بنائے تھیں۔

سرلا کو دیکھتے ہی سلیم اُٹھا اور سرلا کے سیڑھیوں تک پہنچنے میں

چبوترے کے کنارے پر تھا۔ "میں تو آج خود آتا — آپ نے کیوں تکلیف کی؟" کہتے ہوئے سرلا کو کرسیوں تک لایا۔

"جب آپ کئی دن سے نہ آئے تو میں ہی آگئی" سرلا نے جواب دیا۔

دونوں کے کرسیوں پر بیٹھ جانے کے بعد سلیم نے پوچھا۔ "کیا پی جیے گا؟"

"کچھ نہیں — میں ابھی چائے پی کر آ رہی ہوں"

"کیناڈ پلیس کے چکر کا ارادہ ہے یا سینما کا؟"

"کہیں کا نہیں۔ آپ سے دو باتوں پر گفت گو کرنا ہے۔"

"یہ تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا"

"اور اگر آپ نہ آتے — یا — فوراً نہ آسکتے؟"

"کیا اس کا امکان تھا؟"

"امکان کا شبہ ہو چلا ہے۔"

"یہ کس بنا پر؟"

"اس پر بعد میں گفت گو ہوگی پہلے ایک مشورہ لینا ہے۔"

"کیا کوئی نئی خبر کانپور سے ملی؟"

"ہاں — پتاجی کی چٹھی آج ہی آئی ہے — اب ہمارے مخالف صلح کرنے پر تیار ہیں۔"

"پھر کیا ہے؟ صلح سے جنگ تو بہتر ہوتی ہی نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ بعض وقت جنگ صلح سے بہتر ہوتی ہے، بلکہ ضروری ہوتی ہے۔"

"کبھی بھی بہتر نہیں ہوتی، البتہ ضروری بے شک ہوتی ہے۔"

"جب بہتر نہیں ہوتی تو ضروری کیوں ہوگی؟"

"ضروری تو محض اس لیئے ہوتی ہے کہ صلح کا امکان ہی نہیں رہ جاتا۔"

"بلکہ در اصل جنگ صلح حاصل کرنے کا آخری طریقہ ہے۔"

"یوں بھی سہی تو صلح کی شرطیں تو بڑی چیز ہیں۔"

"اس میں کلام ہی کیا ہے؟ — فریقین کی شرائط ہی کا دوسرا نام صلح ہے۔"

"میرے مخالف یہ چاہتے ہیں کہ پانچ لاکھ لے لیا جائے اور ہم باوجود یقین دلاتے ہیں کہ چھ لاکھ ضرور مل جائیں گے۔"

"آپ کے وکیل کے چھ لاکھ اور اُن کے وکیل کے چار لاکھ مجھے یاد ہیں: گویا پانچ لاکھ میں ایک لاکھ آپ چھوڑ رہے ہیں اور ایک لاکھ وہ بڑھ رہے ہیں۔ میں تو اس کو قابلِ قبول سمجھتا ہوں۔"

"مگر وہ ہمارا خرچہ بھی تو نہیں دینا چاہتے۔"

"اور آپ سے اپنا خرچہ بھی نہ مانگتے ہوں گے۔"

"اُن کے خرچہ کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا — اس لئے کہ وہ جیت تو سکتے ہی نہیں۔"

"پھر بھی جس قدر آپ کا در اصل خرچ ہوگا۔ اتنا تو کوئی عدالت نہیں دلوا سکتی اس کی علاوہ جیتنے میں کتنی مدت اور زحمت درکار ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ اِس فکر سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

"میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ پانچ لاکھ پر فیصلہ کر لیجیے، اور خرچہ چھوڑیئے۔"

"ماتا جی کی بھی یہی رائے ہے۔"

"اُن کی رائے صائب ہے۔ وہ سن رسیدہ اور جہاں دیدہ ہیں۔"

"اور آپ؟"

"مجھے صلح پسند نہیں تو پست ہمت سمجھ لیجیے۔"

"یہ نہیں — آپ تدبیر کے قائل ہیں تقدیر کے نہیں۔"

"میں تو تدبیر و تقدیر دونوں کا ماننے والا ہوں۔"

"اِس سے کیا مطلب؟"

"میں تقدیر کو اُس جگہ اور اُس حد سے مانتا ہوں جہاں تدبیر کا دخل ہی نہ ہو۔"

"آدمی کی زندگی میں تقدیر کا دخل نہیں رہا؟"

"اِنسان اپنی تقدیر خود اپنی تدبیر سے بناتا ہے۔"

"ایشور کی طرف سے کچھ نہیں ہوتا؟"

"سب کچھ اُسی طرف سے ہوتا ہے مگر اِنسان کی تدبیر کے لحاظ سے ہوتا ہے۔"

"اور مجھے جو یہ گھر مل گیا وہ کون سی تدبیر کا نتیجہ تھا؟"

"وہ بھی آپ کی ماتا جی کی دوراندیشی"، زبان بدلتے ہوئے، "ماتا جی اور

پتا جی کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اُنھوں نے اپنی تدبیر سے یہ تقدیر بنائی۔"

"کیا خُوب! آخر اُنھوں نے کون سی تدبیر کی؟ اُن کو تو اِس کا وہم بھی نہ تھا۔"

"اُنھوں نے سردار خاں مرحوم کو اِس درجہ خُلوص کا بندہ بنایا کہ سردار خاں نے اُن کی اَولاد کو اپنی اَولاد بنالیا۔ یہ اُن کی بنائی ہوئی تقدیر نہیں تو اَور کیا ہے؟"

"مَیں نے تو آج تک کبھی اُن کی زُبان سے یہ نہیں سُنا کہ اِس اُمید پر دوستی کی ہو یا خلُوص کیا ہو۔"

"آپ کے سُننے نہ سُننے سے کیا مطلب؟ والدین کے تمام افعال اور ارادے اولاد کو نہیں معلُوم ہوتے۔ اکثر راز رہ جاتے ہیں۔"

"خیر تو آپ اِن شرطوں پر صُلح کر لینے کی رائے دیتے ہیں؟"

"بے شک۔ میری ذاتی رائے یہی ہے۔"

"اچھا اب دُوسری بات بتائیے!"

"پُوچھیے!"

"آپ نے کچھ عرصہ سے مجھ سے ملنا کیوں کم کر دیا ہے؟"

"مَیں نے کبھی کم نہیں کیا۔ مَیں کم کر ہی نہیں سکتا۔"

"آپ کو مجھ سے ملے ہُوئے کتنے دن ہُوئے؟"

"پانچ دن ہُوئے۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ مجھے ریڈیو گھر سے شام کو چلے آنے کا موقع صرف ہفتہ میں دو دن ....."

(بات کاٹ کر) "میں جانتی ہوں — سوموار اور برھسپت — مگر آپ نہ پچھلے سوموار کو آئے نہ آج برھسپت کو"

"آج تو میں جانے ہی والا تھا کہ آپ آگئیں — البتہ پیر کو نہ پہنچنے کا قصور وار ہوں"

"اب آپ نے ٹالنا شروع کیا — آپ ہی کا قول ہے کہ اصلیت چھپانے کا سہل طریقہ پوچھنے والے کی ہاں میں ہاں ملانا ہے"

"آپ میرے الفاظ بھول جایا کریں — وہ اضطراری ہوتے ہیں"

"میں بھلانا چاہوں تو نہیں بھلا سکتی"

"تو پھر مجھے گفتگو میں احتیاط کرنی چاہیئے ...."

"کیوں؟" ـــــــ لا نے قطع کلام کیا "کیا آپ مجھ سے جو کچھ کہتے ہیں وہ بھول جانے کے لیے کہتے ہیں؟"

"میں پھر لاجواب ہوں"

"آپ پھر گریز کر رہے ہیں اور چھپانا چاہتے ہیں"

"یقین کیجیئے! میں آپ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہتا"

"تو بتائیے کہ آپ نے مجھ سے ملنا کیوں کم کر دیا؟؟"

"میں بتانے کو تیار ہوں مگر آپ اس سے آگے تو نہیں بڑھینگی؟"

"اگر میں نہ سمجھ سکی تو ضرور آگے بڑھوں گی"

"تو نہ پوچھیئے! میں التجا کرتا ہوں نہ پوچھیئے"

"میں آپ کی التجا سے پہلے پوچھنے کی التجا کر چکی — اب تو آپ کو بتانا

ہوگا۔"

"کیا آج ہمارے اور رُو نے نہ دینے کی مشق مقصود ہے؟"

"اور کیا آپ آج طرح طرح سے گریز کرنے کی مشق کر رہے ہیں؟"

"نہیں مانیتں تو سنیئے کہ میں کچھ عرصے سے ایک منقوش بنانے میں مصروف رہا۔"

"آپ سچ کہتے ہیں؟"

"جھوٹ کہتا تو اتنی دیر نہ لگاتا۔"

"کس کی تصویر بنائی ہے؟"

"آپ کی؟"

"کب سے مصروف تھے؟"

"بیس بائیس دن سے۔"

"مجھ سے کیوں نہیں ذکر کیا؟"

"وہ مکمل نہیں ہوئی تھی۔"

"اب تو ہوگئی؟"

"نہیں اب بھی نامکمل ہے۔"

"خیر۔ میں نامکمل ہی دیکھوں گی۔"

"میں آپ کو نامکمل دکھانا نہیں چاہتا۔"

"مگر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن میں نہیں دکھاؤں گا۔"

"آپ میری اِتنی بھی نہ مانیں گے؟"

"صِرف یہ ہی نہیں مانوں گا۔"

"کیا وجہ؟"

"وجہ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"تو میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"یہ آپ کا ظلم ہے۔"

"ظلم ہی سہی ۔ میں ابھی دیکھتی ہوں" کہتی ہوئی سُرلا جھٹ سے کھڑی ہوئی اور فوراً اِسٹوڈیو کی طرف، جو غالباً اُس کا دیکھا ہُوا تھا، لپکی۔ سلیم نے ہر چند درمیان حائل ہونا چاہا مگر سرلا آگے تھی اور وہ اُس کو چھونے کی جراءت نہ کر سکا پکڑے اور چٹکنے کا کواڑ کھولتے ہوئے وہ فوراً اندر داخل ہو گئی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار سے بھڑا ہُوا، ایک رنگین منقوش اِسٹینڈ پر چڑھا ہُوا تھا۔

اُس نے دیوار کی طرف مُنہ کیا کہ وُہ اپنے سے دو چار تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو ارادتاً اور بلا ارادہ، اپنے اور پرائے آئینوں میں، بڑھتے اُبھرتے، گدراتے اور چمکتے دیکھا ہو، مگر یہ نظارہ بالکل نیا تھا۔ کئی لحاظ سے نیا تھا۔ آئینوں میں اُس نے لباس میں ڈھنکی ہوئی سُرلا پا، اُس کا کھُلا ہوا چہرہ اور ہاتھ ہی دیکھے تھے۔ اور ہاں، جب کبھی دیکھا تھا تو دیکھنے کی کیفیت اُس میں اور دِکھانے کی حالت سامنے والی میں، زیادہ نہیں تو لمحہ بھر کے لیئے پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے کبھی اپنے کو نہ دکھانے کی کیفیت میں نہیں دیکھا۔

یہ باریک وجدانی امتیاز صرف دیکھنے دکھانے سے ہی تعلق رکھتا ہے کیونکہ آنکھیں بے زبان ہیں اور نہ زبان نابینا!

جانگی کنڈ والی سرلا پنڈلیوں گہرے پانی میں کھڑی، سورج نارائن کو جل چڑھا رہی تھی: سفید مہین ساڑھی سر، گردن اور ایک رخ کے سینے سے ڈھلکی ہوئی، اور بقیہ جسم کے زیادہ حصّوں سے ڈبکی میں چپڑا ہو کر، کچھ ایسی وصل تھی کہ ناظر کا یہ یک نظر وصال ہو جائے۔ سراپا کے نشیب و فراز پیکر کی رعنائی، دھرم کا دھیان دوشیزگی کی چستی، شباب کی سحر کاری، بے خودی کی بے حجابی، سب کچھ نمایاں تھا! وہ شاید سورج نارائن کی گرم نظر اور والہانہ گستاخی سے بھی بے خبر تھی!

لباس والی سرلا نے تعزیباً بے لباس سرلا کو دیکھا اور شرم اس کے چہرے پر دوڑ گئی — نظر خود بخود نیچی ہو گئی — پھر دیکھا اور اچٹتی ہوئی نظر سلیم پر ڈالی — وہ نقش کی ستایش طلبی اور افشائے جرم کی خفت میں ڈوبتا اچھلتا، کبھی ایک سرلا سے حمایت چاہتا تھا تو کبھی دوسری سرلا سے معافی۔

اب دیکھنے والی سرلا کے چشم و ابرو میں پندارِ حسن جھلک مارنے لگا اور نظر چرانے والے سلیم کے انداز سے اقبالِ محبت ٹپکنے لگا۔ دونوں کی نظریں کئی دفعہ ملیں اور کئی دفعہ جدا ہوئیں: کبھی تو سلیم کی نظر تاب نہ لا سکی اور کبھی سرلا کی نظر لجا گئی۔ دونوں بہت کہنا چاہتے تھے مگر کہتے کچھ نہ تھے — شاید بے زبان سرلا نے زبان والوں کی بھی زباں بندی

کردی تھی۔ یا۔ سورج نارائن کی دراندازی فوری سکوت کا باعث تھی!
آخر سرلا نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ بڑے جھوٹے نکلے؟"

"اگر کیفیتِ قلبی کو چھپانا جھوٹ ہے تو......"

سرلا نے قطع کلام کیا "آپ تو کہتے تھے کہ تصویر نامکمل ہے۔"

"کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں....."

"یہ نامکمل ہے؟"

"بے شک نامکمل ہے۔۔ اور شاید عمر بھر نامکمل ہی رہے گی۔"

"اب کیا بات باقی ہے؟"

"اس میں اصلیت نہیں۔"

"اصلیت سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ آپ کا منقوش نہیں؛ آپ کی تصویر کا منقوش ہے!"

"میری تصویر آپ کو کہاں سے ملی؟"

"میں نے جنتر جانی گنڈہ پہ سورج اور چاندگرہن کے دوسرے دن ہینبہ ٹھگ سے لی۔"

"چھپ کر، چوری سے لی؟"

"مجھے اس جرم، جسارت، یا پاپ کا اقبال ہے۔"

"اور کس کس کی تصویریں لیں؟"

"اور کسی کی نہیں۔"

"اوروں کو آپ اشنان کرتے نہ دیکھ سکے؟"

"سینکڑوں کو اشنان کرتے اور بیسیوں کو عریاں دیکھا۔"

"پھر میری ہی تصویر کیوں لی؟"

"اس لیے کہ اور کسی نے مجھ میں ذرّہ برابر بھی تحریکِ تصویر پیدا نہیں کی۔"

"اس کو تو رہنے دیجیے۔ یہ کہیے کہ آپ نے مجھے ہی رُسوائی کے لیے پسند کیا۔"

"واقعی، محبت کا ایک رُخ معرفت اور دوسرا رُخ رُسوائی ہے۔"

"آپ مجھے رُسوا کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو اس تصویر کو میرے سامنے جلا دیجیے۔"

"یہ ناممکن ہے — یہ نقوش مجھے جان کے برابر عزیز ہے۔"

"گویا آپ اس کو مجھ سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔"

"آپ کو تو میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔"

"پھر میرے کہنے سے آپ اس کو کیوں نہیں جلا دیتے؟"

"اس کی وجہ نہ پوچھیے۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟"

"اگر میں صاف صاف بتاؤں تو اور زیادہ ناگواری کا احتمال ہے۔"

"کوئی ناگواری نہیں ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ صاف صاف بتائیں۔"

"تو سنیئے۔ یہ میری سرلا ہے۔ اس کو مجھ سے حجاب نہیں۔ اس کو مجھ سے اغماض نہیں۔ (اس کو میرے سوائے کسی دوسرے سے تعلق نہیں۔) یہ میری ہے اور صرف میری ہے۔"

سرلا خاموش ہو گئی اور منقوش کو دیکھنے لگی۔

"اب تو غالباً آپ کا اطمینان ہو گیا؟" سلیم نے چند لمحہ جواب نہ پا کر براً سرلا کو دیکھتے ہوئے کہا "قتل و خودکشی کو خدا بدترین جرم بتاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اپنی جان ڈالی ہوئی مورت کا دوسرے کے ہاتھ سے بے جان ہو جانا برداشت نہیں کرتا......."

"مگر اپنے آپ تو اُس مورت کو مٹا دیتا ہے" سرلا نے قطع کلام کیا۔

"کبھی نہیں مٹاتا۔ روح تو مٹتی ہی نہیں، جسم بھی معدوم نہیں ہوتا۔"

"یہ تو آواگون ہوا۔ آپ مسلمان ہیں یا ہندو؟"

"خالِ ہندو پر مرنے والے کو آپ ہندو کہیں گی یا مسلمان؟"

"خالِ ہندو کیسا؟"

"بتاؤں؟"

"ضرور بتایئے۔"

"گستاخی معاف" کہتا ہوا سلیم آگے جھکا اور اُس نے ایک ہاتھ سے سرلا ٹھوڑی کا تل اور دوسرے ہاتھ سے سیدھے رخسار اور کنپٹی کے درمیان

کا تِل چھوا اور کہا "خالِ ہندو کا ذخیرہ یہ ہے۔"

سرلا شرما گئی اور سلیم پھر سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ لمحے پھر سکوت کے نذر ہو گئے۔

"وہ سرلا جو میرے چھونے سے مکدر نہیں ہوتی، اس کو مٹا دوں؟ ناممکن ۔ قطعی ناممکن!" سلیم منقوش کو دیکھ رہا تھا اور والہانہ بک رہا تھا۔

"لیکن یہ تو نامکمل اور ناقص چیز ہے۔" سرلا نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں پندارِ حسن کے علاوہ کچھ اور جذبہ بھی جھلک مارنے لگا۔

"مکمل اور بے نقص میسر نہ ہو تو کیا کیا جائے؟"

"آپ تو تدبیر کے قائل ہیں۔"

"میں تدبیر کر چکا اور مایوس ہو چلا۔"

"مایوسی کی وجہ؟"

"بابا نے کایا پلٹ دی۔"

"شاید آپ اسی وجہ سے کنارہ کرنے لگے۔"

"کنارہ تو نہیں کر سکتا! البتہ وہ نکاروں سے نیچے رہنے کا لحاظ کرنے لگا۔"

"مگر میں تو اکثر آپ سے کہہ چکی کہ ریڈیو پر لات مارئیے اور میرے ساتھ ......"

"یہ ناممکن ہے ۔ میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔" سلیم نے قطع کلام کیا "میں بے داموں کا غلام ہو سکتا ہوں، مگر داموں کا ہم صحبت بھی نہیں بن سکتا۔"

"محبت کے دعوے میں بھی اپنا ادر پرایا باقی رہتا ہے ؟"

"اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ محبت دُوئی کو دور نہ کر دے اور دونوں طرف شعلہ نہ بھڑک اُٹھے۔"

"آپ کو دوسرے دل کی کیفیت کا بھی علم ہے ؟"

"پوری طور پر یہ نہ ہو سکتا ہے ۔ آنکھیں گمان قوی پیدا کر سکتی ہوں مگر یقین نہیں پیدا کر سکتیں۔"

"آپ زبان پر آنکھوں سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں ؟"

"ہرگز نہیں! ۔ زبان آنکھوں سے بہت زیادہ فریب دہ اور مکار ہے۔"

"پھر یقین آنے کی کیا صورت ؟"

"جب تک دو دل متصل نہ ہوں اور اُن کی حرکت کا سچا پیام ایک دوسرے کو نہ میسّر آئے یقین کامل نہیں ہو سکتا۔"

سرلا جواب دینے کے بجائے منقوش دیکھنے لگی اور سلیم انتظارِ جواب میں اُس کو دیکھتا رہا۔ سرلا کا اندازِ سکوت رشکِ کلام بھی تھا اور دعوتِ عمل بھی۔ سلیم نے دیکھا، تاڑا اور آگے بڑھ کر اُس کو آغوش میں لے لیا۔ سرلا نے نہ بدن چرایا نہ خفیف سی مدافعت ہی کا اظہار کیا۔ وہ سلیم کی

گرفت میں ڈھیلی پڑ گئی۔

سلیم کے سینے سے سرلا کا شباب، لب ریز اور گداز اُبھار متصل ہوتا تھا کہ ایک بجلی سی دونوں جسموں میں دوڑ گئی، دو دلوں کی دھڑکن براہِ راست اصلی کیفیت واضح کرنے لگی اور سلیم نے سرلا کا ہاتھ اُٹھا کر اُس کی ایک اِک گداز اور نازک اُنگلی کو شاخِ نبات بنا ڈالا۔ سرلا نے گردن جھکا کر سلیم کے کندھے کے قریب سر رکھ دیا اور سلیم نے اُس کی گردن پر گھنگھریالے ہونے والے بالوں کے چھلّوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ناگواری کی معمولی سی شان بھی نہ پیدا ہونے پر، سلیم کی جرأت میں اضافہ ہونا فطری تھا۔ اُس نے کنپٹی کے قریب والے خالِ ہندو کو چوما، چہرہ اُٹھا کر چاہِ زنخداں سے اپنی پیاس بجھائی اور آخر کشادہ اور درمیان میں کسی قدر کھلے رہنے والے دہانے کو اپنی طرف اونچا کیا۔ سرلا کا جواب سرپیش عمل کے لیے شرم آمیز رضا تھا؛ اب اُس نے دہانہ اونچا کر دیا اور آنکھیں بند کر لیں؛ اور سلیم نے جھلکنے اور گداز لبوں کو والہانہ اشتیاق کے ساتھ اپنے ہونٹوں میں لے لیا۔

"مجھے یقین نہ تھا کہ تم میری سچّی محبّت کی اِس درجہ قدر کرتی ہو" چند لمحوں کے بعد اپنا مُنہ سرلا کے دہانے سے ہٹاتے ہوئے سلیم نے کہا۔

"لیکن اب یقین ہو بھی گیا تو کیا فائدہ؟" سرلا نے گردن جھکا کر سلیم کے سینے پر چہرہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو تمہارا اُسی لمحہ سے ہوں جب کہ تمہارے حُسن کو میری نظروں کا گرہن پہلی مرتبہ جانکی کُنڈ میں لگا تھا' البتہ اب یقین ہو گیا کہ تم بھی میری ہو۔"

"لیکن میرا اور آپ کا دھرم تو ہم دونوں کو ایک نہیں ہونے دیگا۔"

"پیاری حُسن کی دیبی! پریم کے مندر میں دیواریں نہیں ہوتیں۔"

"مگر سماج میں تو ہوتی ہیں اور سنگین ہوتی ہیں۔"

"فی الحال اُن کا ڈھا دینا ممکن نہ ہو' مگر پھلانگنا تو ممکن ہے۔"

"مگر ماتاجی کے جیتے جی یہ بھی ممکن نہیں۔ وہ دھرم کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتیں۔"

کنوارہ کاتین چوتھائی چاند چوتھائی آسمان سے نور پاش تھا۔ پچھوا ہوا کا ہلکا سا سانس حساس موجودات کو محسوس ہو رہا ہو لیکن پتوں تک کو ہلا نہیں رہا تھا۔ حیوانی دُنیا ہی نہیں، کُل نظریات سکوت کے سفید لباس میں سو رہی تھی۔ سکونِ کائنات کا سراب وقت کی ریگ میں رفتارِ زمانہ کی پے چھل تک سے بے خبر کئے تھا۔ فضائے اسیر مسلسل سانس لے رہی ہو مگر عالمِ اسیر معمولاً غافل تھا۔

آدھی رات کا الگ بھگ تھا اور مورتی باڑے والے راستے کے نشیب میں ایک گول سے پتھر پر، مرمر کی مورت بنی کھڑی تھی۔ پاس ہی جوہی چوکھٹے پر بے رنگ میں رنگ آفرینی، ایک ایک نقش کو فریادِ خاموش بنا رہی تھی اور کنفرزدہ ریشمین قمیص کی ایک آستین چڑھائے، گریبان کھولے، بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر بکھیرے، بے جان میں جان ڈالنے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف تھا۔

وہ ہنومان دھارا والی تصویر چاندنی میں بھی بنا کر، سورج اور چاند کی جداگانہ رنگ آمیزی کا مقابلہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہی مورتی تھی، وہی حباب سا دوپٹہ تھا، وہی دل فریب انداز تھا، مگر وہ کیفیت نہ تھی۔

سماں دوسرا، مقام دوسرا، وقت دوسرا اور موسم دوسرا؛ پھر وہی کیفیت کس طرح ممکن تھی؟ کنزرو اس تبدیلی سے پیدا ہونے والے اثر کا پہلے سے متوقع تھا اور اسے ناگزیر سمجھتا تھا۔ مگر وہ جس یکساں جذباتی کیفیت کا خواہاں تھا، وہ بھی مورتی کے چہرے اور جسم سے عیاں نہ تھی۔ وہ اسی کے پیدا کرنے میں بہت دیر سے سرگرم تھا۔ رہ رہ کر مورتی کو متانت، انبساط، اور مختلف جذبات کے تخیل کی ہدایت کرتا اور چوکھٹے تک ہٹ کر نمایاں کیفیت کو غور سے دیکھتا۔ مگر کبھی تو انبساط ہلکا سا تبسم جھلکا دیتا اور کبھی متانت خفیف سی خود داری جھلکا دیتی۔ بالکل وہی کیفیت، خودنمائی جو ہندوستان دھار اپر پیدا ہوئی تھی کبھی کبھار چند لمحوں کے لئے نمودار ہوتی بھی تو کنزرو کے برش اور رنگ سنبھالتے سنبھالتے غائب ہو جاتی۔ بت کا انسان بننا ناممکن ہو، مگر انسان کا بت بن جانا بھی آسان نہیں۔ آدھ گھنٹے کی متواتر کوشش نقاش کو مایوس اور ماڈل کو ماندہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔

اپنی مایوسی دور کرنے، کنزرو چند منٹ کے لئے الگ بیٹھ جاتا اور مورتی کی پژمردگی رفع کرنے، اس کو آغوش میں لے کر بوسۂ مشترک سے اچھالتا۔ مگر اب ماڈل کے تمام جسم سے فتح مندی کی چمک اور خواہش کی دمک پھوٹ پڑتی۔ وہ خاص کیفیت، جو صبر آزما تمنا، وسوسۂ بیم و رجا اور عالمِ فریبِ خودنمائی کی فطرتی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی، میسر نہ آئی۔ کنزرو کو ان جذبات نادرونی کا علم نہ ہو، اگر مورتی بھی ان ہی کا تخیل پیدا کرتی

تو آمد و آورد کا فرق ہو جاتا، اور اس کے بیرونی اثر کو کنزرو کی آنکھ دیکھ لیتی۔ آخر، آورد سے پیدا ہونے والی یکسانی پر قناعت کرتے ہوئے کنزرو نے اسی تخیل اور کیفیت کو قائم رکھنے کی ہدایت کی اور برش تقریباً مکمل منقوشے پر کبھی کہیں اور کبھی کہیں چلنے لگا۔ وہ رہ رہ کر مورتی کو دیکھتا، رنگ پسند کرتا اور برش چلاتا: پھر ٹھہرتا، ایک قدم ہٹتا، مورتی کو اور منقوشے دیکھتا اور اصلاح کرتا: اس بگاڑنے اور بنانے میں ۔ یا ۔ تکمیلی چھائیاں پیدا کرنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اختتام پہ اس نے برش اور رنگ کا پتّہ ایک طرف رکھا اور پیچھے ہٹ کر تصویر اور موڈل کا تقابلہ سنجیدہ مشاہدہ کرنے لگا۔ مورتی کے جسم پر چاندنی کا رنگ دکھانے کے لیے، وہ ایسی سفیدی بنانا چاہتا تھا جو کسی جگہ سفید چنبیلی اور سفید گلاب کی سفیدیوں کی درمیانی چیز ہو اور کسی جگہ سفید چمپا اور سفید چنبیلی کے رنگوں کی آمیزش ہو۔ وہ آخری مشاہدے سے اپنی کامیابی کا متلاشی تھا۔ اسے آرٹ سے خدبینی کر رہا تھا اور اپنی مورتی کو اپنے خدا کی مورتی سے پھڑا رہا تھا! مسرّت کے لہر اس کے تمام جسم میں دوڑ گئی، اس نے جھپٹ کر مورتی کو آغوش میں لے لیا، اور دو دماغ چند لمحوں کے لیے ایک ہو گئے۔

مورتی نے ریشمین ساڑھی باندھ لی اور یہ دونوں سستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ کنزرو نے زمین پر پڑے ہوئے کوٹ کی جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور مورتی کی طرف بڑھا دیا۔ ایک ہی دیا سلائی سے

شعلے سے دونوں نے سگریٹ جلائے اور باتیں کرنے لگے۔

"تمہارے آرٹ کا تو جیتر کوٹ سے قائل ہؤا، مگر آج تمہارے فن کا بھی قائل ہو گیا"، کنزروسے نے کہا۔

"مگر میں تو صرف آپ کی قائل تھی اور اب بھی ہوں۔" شورتی نے جواب دیا۔

"میری کس بات کی قائل ہو؟"

"کوئی ایک بات نہیں: ہر بات کی اور سب باتوں کی۔"

"گویا میری صفات کی؟"

"صرف صفات ہی نہیں، ذات کی بھی ـــ آپ کی؛ آپ ہیں سب کچھ آ گیا۔"

"اور میں تمہارے حسن کا مداح تھا، لیکن آرٹ کا دل دادہ ہو گیا۔"

"مگر میں آپ کی کسی چیز کی مداح نہیں، اور ہر چیز کی دل دادہ ہوں۔"

"اب تو میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تم کو اپناؤں۔"

"کیا خوب؟ ـ آپ تو مجھے پہلے دن سے اپنا چکے۔"

"اچھا تو یوں سمجھو کہ میں تمہارا ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا ابھی تک آپ چاہتے ہی ہیں، ہوئے نہیں؟"

"تمہارا ہو گیا تو اُس وقت کہہ سکتا ہوں جب تم بھی تسلیم کر لو۔"

"بالکل غلط - میرا ہو جانا میرے تسلیم کرنے پر منحصر نہیں - آپ پر منحصر ہے ۔"

"یہ ہے تو مجھے اقبال ہے کہ میں تمہارا ہو چکا ۔"

"کیا سچ کہتے ہو؟"

"دِل دِکھانے کا نہیں ہے جو دِکھا دے کوئی؟"

"دِل ہی تو وہ شے ہے جو چھپائے نہیں چھپتی - اُس کے دِکھانے کی حاجت ہی نہیں ۔"

"تو پھر یوں سمجھو کہ 'دِل چھپانے کا نہیں ہے جو چھپائے کوئی' — تم میرا دِل خود دیکھتی ہوگی ۔"

"دیکھتی ضرور ہوں — مگر —"

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں ۔"

"مگر یقین نہیں آتا؟"

"یقین تو آتا ہے - مگر محبت میں بدگمانی بھی ہو سکتی ہے ۔"

"بدگمانی کی وجہ؟"

"نہ پوچھو - شاید ناگوار نہ ہو ۔"

"اب تمہاری کسی بات سے ناگواری کی گنجائش ہی نہیں - بتاؤ - بلا تامل بتاؤ!"

"کیا آپ کو ستر لاسے لگاؤ نہیں؟"

"رتی برابر نہیں۔" کنور روپ نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔
"پھر اس آنے جانے سے کیا سمجھوں؟"
"صرف آرٹسٹ کی تلاش۔"
"گویا ابھی آپ کی تلاش باقی ہے؟"
"آرٹسٹ کی تلاش تو مرتے دم تک رہتی ہے۔"
"تو آرٹسٹ کسی کا ہو کبھی نہیں سکتا۔"
"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہر نئے نمونے سے اس کی موزونیت معلوم کرنے کی خواہش آرٹسٹ کو ہونی لازمی ہے۔ یہ خواہش محض ایک نئے مشاہدے کی تلاش ہوتی ہے۔"
"اور اس مشاہدے سے محبت پیدا ہو سکتی ہے۔"
"ہرگز نہیں۔" کنور روپ نے مورتی کے چہرے پر نظریں گڑوئے ہوئے کہا "تم کو تو اس میں شبہہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ میں کتنے عرصے سے تم کو مستقل موڈل بنائے ہوئے تھا؟ کتنے عرصے سے تمہارے جسم اور حسن کا مشاہدہ کر رہا تھا؟ چیتر کوٹ کے سفر سے پہلے مجھے کبھی تم سے محبت نہیں ہوئی۔"
"لیکن ہوئی تو سہی — جلدی نہیں تو دیر میں سہی — آخر یہ ہوئی تو مشاہدے سے ہی۔"
"مشاہدے کے سلسلے میں ضرور ہوئی۔ مگر موڈل بنانے اور حسن کے نمونے مشاہدہ کرنے سے ہرگز نہیں ہوئی۔ تمہارے آرٹ کے

مشاہدے سے ہوئی۔"

"اور اگر سرلا کا آرٹ بہتر نظر آیا تو اُس کی بھی محبت ہو جائیگی؟"

"تم کس خبط میں مبتلا ہو۔ سرلا کو آرٹ سے کیا واسطہ؟ اُس سے ہزار درجہ حسین اور گلے پڑنے والیاں تو مَیں نے یورپ میں ماڈل بنا ڈالیں۔ مجھے تو آج تک نہ کسی میں تمہارا سا آرٹ نظر آیا نہ مجھے کسی سے گرویدگی تو کیسی، دل بستگی بھی پیدا ہوئی۔"

"اب آپ مجھے آسمان پر بٹھانے لگے ....."

"آسمان پر نہیں، دل میں بٹھا چکا" کنٹر دیو نے قطع کلام کیا "تم خود اپنے آرٹ سے بے خبر ہو؛ اس لئے کہ وہ تمہارا پیدا کیا ہوا نہیں ۔۔ وہ تمہارے خون میں ہے۔"

"کیا آپ کا مطلب میری مردہ ماں کے ذلیل پیشے سے ہے؟"

"میرا مطلب پیشے سے نہیں آرٹ سے ہے۔ مَیں تو تمہاری ماں کو بھی ذلیل نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دسے نرائن کی ہو کر رہیں؛ پیشہ کیسا؟"

"مگر سرلا اور اُن کی ماں تو میری مردہ ماں تو در کنار مجھے بھی فاحشہ اور کسبی ہی سمجھتی ہیں۔"

"مجھ سے تو سرلا نے کبھی ایسا کہا نہیں۔"

"آپ کے پاس آتے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے ....."

"ہاں! دس روز سمجھو۔" کنٹر دیو نے پھر قطع کلام کیا "بس۔ جب ہی سے شرما صاحب کشمیری دروازے والی کوٹھی میں آئے اُس کے دو مہینے

تیسرے دن سے سرلا کا آنا جانا شروع ہوا ۔ وہ بھی پہلی دفعہ سلیم کے لائے اور تعارف کرانے سے ۔"
" شرغا صاحب بھی آپ سے ملنے آئے ؟"
" صرف ایک دفعہ ۔ اُس کے بعد میں رٹرن وزٹ کرنے اُن کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ شرغا دوبارہ کان پور چلے گئے ۔ سرلا کی ماں سے مل کر مجھے رغبت کی بجائے نفرت سی ہو گئی .... "
" یہ کیوں ؟"
" وہ کچھ ایسی بے رُخی اور رُوکھے پن سے ملیں کہ میں تو جا کر بھی پچھتایا ۔"
" وہ تو آپ کو بھی عیّاش اور اوباش سمجھتی ہیں ؟"
" میں نے اُن کے کُنبے برادری کی کون سی لونڈیا سے عیّاشی کی ؟"
" اُن کا کُنبہ برادری تو آپ کا روادار ہی نہیں ...."
" کیا خوب ؟ روادار نہیں ' یا ۔ میں ہی کسی کو منہ نہیں لگاتا ۔ میں اگر ذرا بھی ملنا چاہوں تو یہ لوگ تو میرے آگے زمین پر بچھ جائیں ۔"
" یہ آپ کا خیال ہے ۔"
" خیال نہیں یقین ہے ۔ اکثر دعوتوں کا تجربہ ہے ۔ اِن میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اُس کی لڑکی یا بہن مجھے پھانس لے ۔"
" یہ آپ کی خوبصورتی کی وجہ ہو گی ؟"
" بالکل نہیں ۔ میری دولت کی چکا چوند ہے ۔"

" تو پھر سرلا کی ماں نے بےرُخی کیوں کی ؟ "

" وُہ عورت تو کچھ خَر دماغ ہے ۔ یا شاید نئی دَولت سے بَددماغ ہو گئی ہے ۔ "

" دَولت اُن کو تو ملی نہیں ہے ۔ "

" اُس کو نہ سہی ، اُس کے خاوند کو سہی ۔ "

" نہ اُن کے خاوند کو ملی ۔ "

" پھر کس کو ملی ؟ "

" سَردار خاں نے اپنی دَولت تو سَرلا کو وصیّت کی ہے ۔ "

" اچھا ؟ " حیرت کے ساتھ کُنزرُو نے دُھرایا " مَیں تو سُنتا ہُوں کہ سَردار خاں اَور شَرغا کی دانت کاٹی روٹی تھی اَور اُس نے شَرغا کو ہی سب کچھ دیا ہے ۔ "

" بالکل جھُوٹ ۔ شَرغا وَرغا کو نہیں سَرلا کو دَولت دی ہے ۔ "

" تُمہیں کیُوں کر معلُوم ہُوا ؟ "

" سلیم سے ۔ اُن کو سب سچّا واقعہ معلُوم ہے ۔ "

" جب ہی سَرلا سے بھی کچھ تمکنت کی بُو آتی ہے ۔ "

" کیُوں نہ آئے وُہ لکھ پتی ہے ۔ لکھ پتی کی لڑکی ہے ۔ "

" کیا مَطلَب ؟ "

" مَطلَب صاف ہے ۔ "

" مَیں نہیں سَمجھا ۔ "

"سردار خاں نے وصیت میں لکھا ہے کہ میں سرلا کو اپنی بیٹی بنا کر یہ دولت دیتا ہوں۔"

"یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ سردار خاں سرلا کو بہت چاہتے تھے۔"

"مگر اس قدر چاہت کی کیا وجہ کہ اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر لاکھوں کی دولت ایک غیر لڑکی کو دیدی جائے۔"

"آخر گود بٹھانا بھی تو ہوتا ہے۔ اس میں بھی تو ایک غیر کو لے کر اپنوں کو ورثہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

"مگر مسلمانوں میں تو گود بٹھانا جائز نہیں......"

"میں بھی جانتا ہوں؛ مسلمان کسی کو متبنیٰ نہیں کر سکتا۔ مگر میرا مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ انسان بعض دفعہ اپنوں سے اس درجہ نفرت کرنے لگتا ہے کہ ایک پرائے کو سب کچھ دے جاتا ہے۔"

"مگر جس کو دیتا ہے اس سے کوئی تعلق تو رکھتا ہے یا پیدا کر لیتا ہے۔ راستہ چلتے کو تو نہیں دے جاتا۔"

"صحیح ہے۔ یہاں بھی شرما جی سے تعلق اور دوستانہ تھا۔ اسی لحاظ سے سرلا سے بھی ہو گیا۔"

"مگر سرلا سے چاہت تھی تو اس کو اپنے جیتے جی کیوں نہ ہبہ کر دیا۔ یا۔ نقد دے دیا؟"

"شاید اس وجہ سے نہ دیا ہو کہ جیتے جی دینے سے سردار خاں کے کنبے والے ان کی زندگی حرام کر دیتے۔"

"وصیت ہی کرنا تھی تو شرغاجی کے نام کیوں نہیں کی ؟"

"شرغاجی کے نام کرنا یا اُن کی اکلوتی لڑکی کے نام کرنا ایک ہی بات ہے ."

"ایک بات کس طرح ہے ؟ آج سرلا ماں باپ سے بگڑ جائے یا شادی ہو جائے پر اُس کا شوہر ماں باپ کا پتہ کٹوا دے تو شرغاجی کو کیا مِل سکتا ہے ؟"

"کچھ نہیں مِل سکتا ."

"پھر شرغاجی کے نام کرنا اور سرلا کے نام کرنا ایک ہی بات تو نہیں ہوئی ."

"بے شک نہیں ہوئی ."

"تو کیا سمجھا جائے ؟"

"تم ہی بتاؤ کیا سمجھا جائے ؟"

"آپ عمنی تو ہیں نہیں جو خود نہ سمجھ سکیں . چھندرا سے تم سے کیا فائدہ ؟"

"تجاہل عارفانہ کا تم سے کیا تعلق ؟ - میں ایسی خرافات صرف سن لیا کرتا ہوں - اُس پر اپنا دماغ خراب نہیں کرتا - میں وہ اصلی اور کچھ نہیں سمجھا ."

"صاف ظاہر ہے کہ سردار خاں سرلا ہی کو دینا چاہتے تھے ، شرغاجی کو نہیں دینا چاہتے تھے ."

"بے شک - معلوم تو یہ ہی ہوتا ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"میں نہیں بتا سکتا ــ تم پھر کہو گی کہ میں چھندرا تا ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے سرلا کہاں پیدا ہوئی تھی؟"

"سنتا ہوں کہ کان پور ہی میں پیدا ہوئی تھی۔"

"پیدا ہی نہیں ہوئی بلکہ اپنی ماں کے پیٹ میں بھی کان پور ہی میں آئی تھی۔"

"صحیح ہے - شرغا تو کئی برس کان پور میں تعینات رہے۔"

"ذرا یہ بھی بتائیے کہ شرغا کے کوئی اولاد پہلی بیوی سے یا کان پور کے زمانے کے سوائے ان بیوی سے بھی ہوئی؟"

"نہیں ہوئی......"

"اب یہ بھی غور کیجئے کہ سردار خاں کا دستانہ سرلا کے پیٹ میں آنے سے پہلے......"

"کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ سرلا دراصل سردار خاں کا نطفہ ہے؟"

"میرا مطلب کیسا؟ یہ تو ایسا صاف ہے جیسے روز روشن۔"

"بات تو بہت کچھ لگتی لگاتی ہے۔"

"سردار خاں مسلمان اور شرغا جی ہندو - ان دونوں میں سے ایک بھی ایسا آزاد خیال نہیں جیسے آپ یا میں۔ پھر سردار خاں کان پور کے رہنے والے، جہاں کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔"

"واقعی اَب تو مجھے بھی یہی گمان ہونے لگا۔"

"مَیں تو سمجھتی ہوں شاید 'سردار' کے پہلے حصّے کے لحاظ سے 'سرلا' نام رکھا گیا۔ دونوں ناموں کا پہلا حصّہ سَر ہے۔"

"بڑی دُور کی سوجھی!" کنور وُرمے نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک نام سَر رکھتا ہے، دُوسرا سَر مانگتا ہے۔ کیا خُوب! کیا خُوب!"

"یہ نزاکت تو آپ نے پیدا کی۔"

"مگر سُوجھ بُوجھ تو تمہاری ہی ہے۔"

کنور وُرمے نے سگریٹ پھینکتے ہوئے سُورتی کو پھر آغوش میں لیا کہ اُس نے بھی سگرٹ پھینک دیا۔

"آرٹ اور فن تو گرویدہ بنا ہی چکا ہے۔ اَب اِس ذہانت نے تو اُلّو ہی کر دیا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم میں یہ تمام خُوبیاں ہیں۔"

"مائی ڈیر سلیم!

تم ندوتوں سے نہیں آئے۔ کیا وجہ ہے؟
اس کا جواب لینے مَیں خود آج شام کو پہنچوں گا۔
چائے کے لیے انتظار نہ کرنا۔ مَیں چھ بجے تک
تمہارے پاس ہوں گا۔

تمہارا مخلص

جگ موہن۔"

ساڑھے چھ بج چکے تھے، اس لیے سلیم نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہی کنور رو کا خط پھر پڑھا کہ شاید وقت سمجھنے میں اُس سے غلطی ہوئی ہو۔ وُہ چائے پی چکنے کے بعد محض کنور رو کے انتظار میں تنہا چبوترے پر بیٹھا تھا اور مینڈک کی کرسیاں حسب معمول حلقہ بنائے تھیں۔ "ندوتوں سے نہیں آئے"، کے الزام پر وہ مُسکرا رہا تھا۔ آج شاید دسواں دِن ہو گا کہ وُہ کنور رو سے موڑ سے دہی کو، رسٹوراں میں ملا تھا اور دُو ہفتے ہوتے ہوں گے کہ "کنور رُو کو بچ" گیا تھا۔ غالباً یہ جملہ انگریزی کے محاورے

"ایجز" کی قلب ماہیت تھی۔ وہ غور کر رہا تھا کہ انگریزی تعلیم کے زیرِ اثر اکثر ہندوستانی تعلیم یافتہ کا تخیل انگریزی میں ہوا کرتا ہے کہ ایک رِن کی آواز بہت دور سے آئی اور اُسے کنزرو کی کار کا شُبہ ہُوا۔ پانچ منٹ نہ گُذرنے پائے تھے کہ شُبہ یقین سے بدل گیا اور کنزرو کی "کوئی ہے؟" دروازے سے سُننے میں آئی۔

"سلیم ہے اور خالی کرسیاں ہیں" سلیم نے چیخ کر جواب دیا۔

"کنزرو ہنستے ہُوئے سامنے تھے۔ سلیم کھڑا تو ہو ہی چُکا تھا، آگے بڑھا اور چبوترے کے کنارے پر دونوں ہاتھ ملے ہی نہیں، گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو جھٹکتے رہے۔ کُرسیوں تک بڑھنے اور بیٹھنے میں ہی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔

"کہاں رہتے ہو — کچھ پتہ ہی نہیں چلتا؟" کنزرو نے پوچھا۔

"ابھی لاپتہ ہونے کے مرتبہ تک نہیں پہنچا ہوں" مُسکراتے ہُوئے سلیم نے جواب دیا۔

"آخر ہو کس شغل میں جو ملتے ہی نہیں؟"

"وہی معمولی اوقات — کوئی خاص بات نہیں"

"پھر آنا کیوں کم کر دیا؟"

"اس لحاظ سے کہ اب مخل ہونے کا اندیشہ تھا"

"تم اور مخل ہوتا؟ — یہ وہم کیوں پیدا ہوا؟"

"نئی شاہ کار کے دیکھنے سے"

"اِس کو تو مہینہ بھر ہُوا اُس کے بعد بھی ہو آئے ہو۔ کوئی فرق مجھ میں محسوس کیا؟"

"دُنیا بھر کے ساتھ اس تعلّق کے بعد فرق ہونا لازمی ہے۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ محبت کے سوائے اور کوئی فرق نہ پیدا ہُوا، نہ ہوگا۔"

"کیا آپ مورتی کو اپنا نہیں بنائینگے؟"

"وہ تو میری محبّت سے پہلے ہی میری بن چکی۔ البتہ اب مَیں بھی اُسی کا بن گیا۔"

"تو پھر مَیں کیا غلط سمجھا؟"

"شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ہِول ہِرنج کے رنگ میں اُسے اپنی بیوی بناؤں گا۔"

"آپ کی آزاد خیالی کے باوجود، میں یہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"دُنیا میں رہتے ہُوئے، سماج کا لحاظ ضروری ہے۔ سماج کے رنگ اور طریقے ہمارے ہی زمانے کے بنائے ہوئے ہیں اور تہذیب کی ظاہری صُورت ہماری ہی مانی ہوئی ہے۔"

"مجھے نہ دُنیا سے مطلب، نہ سماج سے۔ میری دُنیا تو آرٹ ہے اور میں اُسی دُنیا میں رہُوں گا۔"

"لیکن ایک عورت کو اپنے سے وابستہ کر لینے کے بعد آرٹ کی

دُنیا کے ساتھ ہی ایک دُوسری دُنیا کی بھی بُنیاد پڑ جاتی ہے۔"

"یہی تمھاری غلط فہمی ہے۔ شاید تمھارا مطلب عورت و مرد کے جنسی تعلّق سے ہے ...."

"جی ہاں! محبّت کی دُنیا میں بھی وصل اِنتہائی مقصد ہے اور وصل زن و شو کے جنسی تعلّق کا دوسرا نام ہے۔"

"عموماً یہ صحیح ہو، مگر لازمی نہیں۔ وصل کی تعریف ہمیشہ جنسی تعلّق نہیں ہوتی۔ محض محبّت کی خاطر محبّت کرنے والے کو جنسی تعلّق سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اُس کا وصل محبوب کو اپنا لینا ہے۔"

"آخر اپنا لینے سے کیا فائدہ؟ بظاہر تو یہ محض فضول سی چیز ہوگا۔"

"فضول ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اپنا لینے سے پیدا ہونے والا اِنبساط سب سے بڑا فائدہ اور مقصد ہے۔ جنسی تعلّق پیدا کرنے سے وُہ مجرد اِنبساط حیوانی لذّت سے بدل جاتا ہے اور اُسی لمحے سے حیوانی دُنیا کی بُنیاد پڑ جاتی ہے۔ دراصل اُس مجرّد اِنبساط ہی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لُطفِ شوق، لذّتِ یک سوئی، بلکہ دوامِ مسرّت، سب ہوا ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے لُطف و اِنبساط کو قائم رکھنا چاہتا ہوں، زائل کرنا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احتمال ہے کہ آپ آگے چل کر امرد پرستی نہ اختیار کر لیں" سلیم نے مُسکراتے ہوئے کہا "پاک محبّت کے مدّعی امرد ہی سے محبّت

کرنا اپنا شعار بناتے ہیں۔"

"محبت ہمیشہ پاک ہوتی ہے؛ اُس کو ناپاکی سے تعلق ہی نہیں۔ پاکی و ناپاکی کا تعلق ذہن میں آتا ہی ثابت کرتا ہے کہ محبت کی بجائے خواہشِ فطری مقصود ہے اور محبت محض بیرونی فریب ہے۔ امرد پرستی دراصل محبت شعار کی شرمناک شکست ہے۔ یا تو وہ امرد پرستی کے ساتھ ایک عورت کو بھی جذبۂ حیوانی کی خاطر تاکتا ہے اور حیوانیت پر صرف پردہ ڈالنے کے لئے امرد پرستی بگھارتا ہے، وہ کم زور اور بودا ہوتا ہے جس کو زن پرستی میں جذبۂ حیوانی سے چپت ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں امرد پرستی کو ہر طرح شرمناک شکست سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے یہ ارادہ مس مورتی پر بھی ظاہر کر دیا؟ — عورت کے جذبات تو غالباً ایسی کم ہمتی کو پسند نہیں کر سکتے۔"

"مورتی پر ظاہر ہی نہیں کیا بلکہ اُس کی رضامندی معلوم کر لی۔ وہ بھی اپنے حسن اور شخصیت کو حیوانی خواہش پر نثار کرنا نہیں چاہتی۔ عورت میں حیوانی خواہش زیادہ ہونا بھی پرانا اور حماقت آمیز خیال ہے۔ بائیالوجی[1] یا حیوانیات اس کے بالکل خلاف ثابت کرتی ہے۔ مادہ کی خواہش خاص زمانے اور اوقات تک محدود ہے اور نر کی زمانہ و وقت کی بھی پابند نہیں۔ ہم دونوں نے عہد کر لیا ہے کہ ہماری محبت بوس و کنار

---

[1] Biology حیاتیات

آگے نہ بڑھے۔"

"خدا کرے کہ یہ عہد قائم رہ سکے ورنہ حیاتیات اور مقصدیِ زندگی کے اعتبار سے تو آپ کا عہد مہمل ہی نہیں نامکن بھی ہے!" ۱۳ جنس

"شاید تمہارا مطلب 'پرپزیو لائیف' سے ہے جو ڈاکٹرن آف ایمرجنسی اور ڈویلپمنٹ آف نوولٹی ۱۴ کے خیالات پر منحصر ہے۔ لیکن آج تک حیات کا مقصد تو معلوم نہیں ہوا جو تم ہمارے عہد کو اس مقصد کے خلاف ثابت کر سکو۔ مہمل اور نامکن کا تو ذکر ہی کیا؟"

"یہ تو آپ کی زیادتی ہے" سلیم نے سگریٹ کیس کنزرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "مقصدِ حیات کی وضاحت حیاتیات نے بھی کی ہے اور نفسیات نے بھی۔"

"وہ کون سی وضاحت ہے؟" کنزرو نے سگریٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ایک طرف 'بی ہیویرزم' نے کی ہے اور دوسری طرف سائیکو اینالیسس

حیاتِ مقصدی Purposive Life

نظریۂ ظہورِ ناگہانی Doctrine of Emergency

نمودِ ندرت Development of Novelty

نظریۂ کرداریت Behaviorism

نظریۂ تجزیۂ نفسیات Psycho-Analysis

نے؟" دیا سلائی نکالتے ہوئے سلیم نے جواب دیا اور دیا سلائی جلا کر کنزرو کی طرف بڑھائی۔ کنزرو نے سگریٹ سلگا کر "شکریہ" کہا اور سلیم نے اپنا سگریٹ بھی اُسی دیا سلائی سے سُلگا لیا۔

"ایک نے بھی نہیں کی۔" ٹانگیں پھیلاتے اور کرسی سے تکیے پر سہارا لیتے ہوئے کنزرو نے اعتراض کیا "مادی نفسیات کی انتہائی پرواز 'بی ہیویرزم' ہے جو پیولوف[1] کے کتوں کی رال ٹپکانے سے پیدا ہوئی......"

"سگِ دُنیا کی اصلیت کتے سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔" مسکراتے ہوئے سلیم نے قطعِ کلام کیا۔

"لیکن یہاں تو کُتے کی اصلیت نہیں معلوم ہوئی بلکہ معلوم کرنے والے کی اصلیت نمایاں ہو گئی۔ مادی نفسیات نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء اور اُنیسویں صدی کی مادہ پرستی کی بنا پر نفس کو غائب کرنے کے لیے "بی ہیویرزم" کا روپ دھارا مگر عین اُسی وقت طبیعات نے 'ایٹم[2]' کو 'الکٹرون[3]' بنا کر ساری مادیت کی جڑ اُکھیڑ ڈالی۔ نفسیات جس مادی گھر میں گئی اُس کو فزکس[4] نے گرا دیا......"

---

[1] Pavlov
[2] Atom مادّے کا قلیل ترین ذرّہ
[3] Ectron منفی برقہ
[4] Physics طبیعات

"نفس سے انکار تو نہیں کیا۔ بلکہ نفس کو مادّے کی انتہائی لطیف و جلا کی ہوئی صورت مانا جس میں مادّے کے نوعی ارتقا سے لے کر دماغی ارتقا تک کی منازل طے کرنے سے شعور پیدا ہو گیا ہے۔"

"اِس اصطلاحی اُلٹ پھیر سے تو کام نہیں چلتا — جب مادّہ ہی محض برقی موج رہ گیا اور وُہ بھی منفی تو وہ کیا گیا جس میں شعور و عقل پیدا کی جائے؟"

"تو آپ سائیکو اینالِسِس کو مانیں گے"

"کیا خوب؟ مَیں اُس نظریے کو مانوں جو آرٹ کو محض قوتِ واہمہ کا دھوکا بتاتا ہے" کنزرو نے طنزاً کہا "یہ نظریۂ فرئیڈ[1] اور ایڈلر[2] نے اپنی اپنی بلند پروازی سے مختلف صورتوں سے بنایا ہو مگر دونوں آرٹ کے مذاق سے کورے تھے۔ فرئیڈ کا تخیّل انسان کو ان کانشنس مائنڈ[3] کا کھلونا بنا دیتا ہے اور ایڈلر بے لگام ڈزائر[4] یا انسٹنکٹ[5] کا۔ دونوں کی بنیاد یہ ہے کہ کانشنس[6]، ریزن[7] اور ٹرتھ[8] کی اصلیت نہیں۔ لطف یہ ہے کہ

۱؎ Freud — ۲؎ Adler

۳؎ Unconnscious Mind — نفسِ غیر شعوری

۴؎ Desire — ۵؎ Instinct — جبلت، جذبی تحریک

۶؎ Conscience — ۷؎ Reason — عقل

۸؎ Truth — صداقت

اِس نظریئے سے خود اُسی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اگر سچائی کوئی شے نہیں تو اِس نظریئے کے سچے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ نظریہ محض ماننے والے کے "اَن کانشس مائنڈ" کا کرشمہ ہے۔ یا۔ بے لگام "ڈِزائر" کا کرتب۔ نہ اِس کو کسی دُوسرے نظریئے پر ترجیح دینے کے لئے عقل ہے نہ اِس کی حقیقت کا اندازہ کرنے کے لیئے صدق؛ اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ ایسے نظریئے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں؟"

"حیات کا مقصد انتہائی صاف صاف نہ بیان کیا جا سکے، مگر حیات کا جتنا بھی تعلق اور رابطہ ہے تو صرف "اِکس پیریمنٹل" یا امتحاناً ہے......"

"تو پھر میرا اور مُورتی کا عہد بھی اِکس پیری منٹ[۱۰] ہی سمجھ لو!"

"مگر یہ تجربہ یا امتحان انفرادی ہے......"

"اور وہ کونسا نظریہ، اعتقاد، یا مسئلہ ہے جو اوّل اوّل انفرادی نہ ہُوا ہو؟"

"آخر اِس تجربے کا مقصد کیا ہے؟"

"یہ آزمایش کہ حُسنِ انسانی کی محبت تمام فطری خواہشات سے جُدا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہو سکتی ہے تو پائیدار بھی ہو گی؟"

---

۹ Experir

۱۰ Experiment امتحان تجربہ

"معاف کیجیے یہ بھی آپ کی انوکھی جدّت ہے۔ ایسی مثالیں ہیں کہ تنہا رہ کر مرد نے یا عورت نے تمام عمر جذبۂ جوانی کے بغیر گذار دی، مگر یہ کہ مرد و عورت محبّت کی بنیاد پر یک جا ہو کر اُس جذبے کا نام نہ آنے دیں، غالباً پہلا تجربہ ہو گا۔"

"اِسی وجہ سے ہم دونوں اِس تجربے کے لیئے تیّار ہوئے ہیں حُسن کے علاوہ مجھے فطری آرٹ کے باقی رہنے کا بھی امتحان کرنا ہے۔"

"اِس سے آپ کا کیا مطلب ؟"

"موروثی کا وہ آرٹ جو ورثے کے طور پر اُسے ملا۔"

"آپ کا مطلب اُس کے مادری ورثے سے ہے ؟"

"ہاں! مادری ورثے سے"

"اگر موسیقی سے مطلب ہے تو موروثی کو اُس سے تعلّق ہے اور رہے گا۔ اور ایک ہی کا ہو کر رہنے سے مطلب ہے تو وہ تموّل کے ساتھ وابستہ ہے"

"موسیقی سے میرا مطلب نہیں" کُنزرُو نے جواب دیا "مگر جس آرٹ سے میرا مطلب ہے وہ تموّل سے تعلق نہیں رکھتا۔ زر پرستی آرٹ نہیں ہو سکتی۔"

"مگر حصولِ زر کے لئے ظاہر و باطن کا ایک سا ہونا تو بڑی بات ہے۔"

"بڑی بات ہے، مگر یہ بھی آرٹ نہیں"

"پھر کس خوبی کو آپ آرٹ کہتے ہیں؟"

"جس کو جی چاہے اُس کو موہ لینا"

"یہ تو کشش حُسن — یا — خوب صورتی کی فطری خوبی ہوئی؛ آرٹ کیسا؟"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہر طوائف خوب صورت ہوتی ہے؟ اور اگر خوب صورت نہیں ہوتی اور موہ لینے کا جذبہ اگانا آرٹ نہیں ہے تو درجنوں مرد اُس کے گرد چکر کیوں کاٹا کرتے ہیں؟"

"محض جذبۂ حیوانی کی خاطر۔" سلیم نے جواب دیا "اُن کو طوائف پیشہ عورت صرف روپیہ خرچ کرنے سے میسّر آسکتی ہے۔ اس لیے ہر روپے والا اپنی حیوانی خواہش کی خاطر طوائف کی طرف رجوع کرتا ہے اور جنسی تحریک کے باعث چکر کاٹا کرتا ہے۔"

"مجھے تم سے اختلاف ہے" کنور رُو نے سگریٹ کا ایک کش لے کر اور پشت کُرسی کے تکیے سے جُدا کرتے ہوئے کہا "روپیہ حاصل کرنا طوائف کا "سیکنڈری اوبجکٹ"[1] ہے: پرائمری گول[2]، موہ لینا ہے......"

"میں طوائف کا تنہا مقصد حصولِ زر سمجھتا ہوں۔ تسخیرِ دل مقصدِ اوّلیں نہیں بلکہ ذریعۂ حصولِ مقصد ہے۔"

---

[1] Secondary Object مقصدِ ثانوی

[2] Primary Goal مقصدِ اوّلیں

"یوں ہی سہی ــ پھر بھی وہ آرٹ تو ہے" کنسرڈو نے اعتراض کیا "ایک دل کو اپنی طرف کھینچ لینا محبّت کی بنیاد رکھنی ہوئی۔ اِس سے اونچا اور کون آرٹ ہو سکتا ہے؟ روپے کی قوّت سے اِنکار نہیں، مگر آرٹ کی عظمت اُس سے اونچی چیز ہے۔ روپے کی قوّت حیوانی جذبات کی جان ہے اور طوائف تک ہی محدود نہیں۔ کیا اونچی ناک والا سماج زرپرستی نہیں کرتا؟"

"کرتا ضرور ہے مگر اُس کی خاطر اپنی عزّت ناموس تک کو بیچ نہیں دیتا۔"

"غلط!" کنسرڈو نے بے ساختہ کہا "قطعی بیچ دیتا ہے: کسی عزّت کا خیال نہیں رکھتا۔ آخر سرلا کا لکھ پتی بن جانا کیا ہے؟"

"محض اِتّفاق، یا کرشمۂ تقدیر۔"

"راج کماری دیبی کا سردار خاں سے میل جول محض اِتّفاق؟ اُسی میل جول کے زمانے میں پیدائش محض اِتّفاق؟ سردار خاں کے نام سے ملتا جلتا لڑکی کا نام رکھا جانا محض اِتّفاق؟ اور لاکھوں کی دولت صرف سرلا کو دے جانا محض اِتّفاق؟" کنسرڈو کرسی پر سلیم کی طرف جھکا ہوا طنز بہ زہر اُگل رہا تھا "تو پھر تمام عالم اِتّفاق اور حیات بھی اِتّفاقیہ؟"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سرلا دراصل سردار خاں کا نطفہ ہے؟"

"جھنڈ را نے کی ضرورت نہیں — تم کیا سمجھتے ہو؟"

"میں اور آپ سے جھنڈ رانا؟" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا: - آپ اس وقت اپنی عادت کے خلاف کچھ برافروختہ سے ہو گئے"

"آخر بتاؤ تو سہی، تم کیا سمجھتے ہو؟"

"مجھے بھی ایسے ہی شبہات ہوتے ہیں جو آپ کا مطالبہ ہے؛ مگر میں اِس معاملے میں زیادہ کیوں غور کروں — مجھے اُس سے سروکار نہیں"

"اور مجھے جدید انکشافات میں سب سے زیادہ نفرت اسکپٹی سزم[1] سے ہے: کسی وجود یا مسئلے کے اقرار و انکار کے درمیان ایک پہلو تراشنا عقل و شعور کی المناک توہین ہے۔"

"آپ کو اِس معاملے کی چھان بین سے کیا تعلق؟"

"تعلق جبلی — یعنی اِنتقام"

"میں نہیں سمجھا۔"

"یوں سمجھو کہ میں نے حورتی کا اِنتقام لے لیا اور سُر لاکے منہ پر سب کچھ کہہ کر اُس کا لطف حاصل کر لیا......"

"یہ کب؟" سلیم نے بے تابانہ قطع کلام کیا۔

"ابھی ابھی تمھارے پاس آنے سے پہلے سے —"

"آپ نے غضب کیا!" بے ساختہ سلیم کی زبان سے نکلا۔

---

[1] Scepticism فلسفۂ شک و شُبہ — لاادریت

سرلا کنز رُو کے زُبانی کچوکے لئے ہوئے واپس آئی تو اس خارجی تحریک سے اُس کا نفس غیر شعوری طیش کے زیر اثر انتقام کے لیے آستین چڑھائے تھا؛ نفس درمیانی ڈر کے مارے دبک گیا تھا اور نفس شعوری چاروں شانے چت تھا۔ سرلا کو یقین تھا کہ اُس کی شریف اور معصوم ماں پر کنز رُو نے اپنے گھر میں نہایت پاجیانہ حملہ کیا جس کی کوئی اصل بنیاد سوائے جھوٹی تہمت کے اور کچھ نہ تھی۔

"اگر کنز رُو یہ کیوا س میرے گھر میں کرتا تو چھٹی کا دُودھ منہہ میں آجاتا؛ میں تو ایسے کمینے سے زبان نہ ہلاتی مگر میرے اشارے پر میرے نوکر اُسے جُوتیوں کے بھیجا ہلا دیتے؛ پر وہ میرے گھر میں ایسا کرتا ہی کیوں؟ وہ تو کمینہ، ذلیل اور رذیل ہے، بازاری کُتوں کی طرح اپنی ہی گلی میں شیر ہوتا جانتا ہے"۔

سرلا خیالات کی امواج میں ڈوب رہی اور اُچھل رہی تھی۔

"اکنز رُو تو میرے ہاں آتا نہیں، میں کیوں جاتی ہوں؟ — نہ میں ہاں جاتی نہ یہ ذلت گوارا کرنی پڑتی؟ — نہ سلیم مجھے ایسے پاجی آدمی سے ملواتے نہ مجھے وہاں جانا پڑتا؛ لیکن سلیم نے تو کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں،

اس سے میل جول بڑھاؤں — سلیم خدا ایسے کمینے سے کیوں ملتے ہیں؟ کیا آرٹسٹ سب ایسے ہی ہوتے ہیں؟ — نہیں — ایسا تو نہیں معلوم ہوتا — سب انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں — لیکن انگلیاں تو مؤنث ہیں اُن کے یکساں نہ ہونے سے کیا نتیجہ؟ — مذکر تو انگوٹھا ہے — انگوٹھا ہمیشہ انگلیوں سے الگ — چار انگلیوں کے ساتھ ایک انگوٹھا — ایک انگوٹھا چار انگلیوں پر بھاری — انگوٹھا کاٹ ڈالو تو ہاتھ کی گرفت ختم یہ کیا؟ — کیا یہ مطلب ہے کہ چار مادہ ہوں تو ایک نر کافی ہوتا ہے؟ — میں کیا بک رہی ہوں، کہاں سے کہاں چلی گئی ...."

"سرلا کے خیالات کچھلے کے لئے گڈ مڈ ہو گئے۔ جبلی تحریک کے ایڑ لگانے پر دماغ حافظے کے میدان میں اپنی دوڑ کا سرا تلاش نے سرپٹ چلا۔ چند لمحے گزرے تھے کہ سرلا نے پھر نہ بولے جانے الفاظ میں تخیل شروع کر دیا۔

"........سلیم ایسے نہیں ہیں — وہ شریف اور نیک ہیں — میں اس پاجیانہ حرکت کا ذکر کر دوں تو وہ کنبز رقو سے نفرت کرنے لگیں گے میں ضرور کہوں گی اور اُن کا میل جول بند کرا دوں گی — لیکن اس سے کیا فائدہ؟ — اُس پاجی کا کیا نقصان ہوا؟ وہ تو اپنی فاحشہ کے ساتھ مگن ہے؛ چاہے سلیم ملیں یا نہ ملیں؛ اُسے پروا کیا ہے؟ اس طرح تو میرا دل ٹھنڈا نہیں ہوگا — پھر اُس کو کس طرح نیچا دکھایا جائے؟ — جانے بھی دو — کتا اگر آدمی پر بھونکے تو آدمی اُس پر نہیں بھونکتا؛

اپنی راہ چلا جاتا ہے — واہ ؟ جانے دو کی بھی ایک ہی ہوئی! — کتنے کے ساتھ آدمی بھونکتا نہ ہو، مگر ایسا ڈنڈا مارتا ہے کہ کتا ٹیں ٹیں کرتا دُم دبائے بھاگنے لگتا ہے — اس کتے کے ساتھ بھی ایسے ہی برتاؤ کی حاجت ہے — بے شک، یہ ہی ہونا چاہیئے — بیچ بازار میں دن دہاڑے اس کے جوتے لگنے چاہیئں جب میرا دل ٹھنڈا ہوگا۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے ؟ — کیوں نہیں ہو سکتا — سنو پچاس روپے دو چار شہدوں کو چٹا دوں تو بیچ بازار میں مارے جوتوں کے بھیجا ناک کے رستے نکال دیں تو سہی — لیکن اس کا انتظام کون کرے ؟ سلیم سے کہوں گی — وہ رہتے بھی ہیں ایسی جگہ جہاں پورا انتظام ہو سکتا ہے ؛ شہدے تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہی ملتے ہیں — وہ آسانی سے انتظام کر دیں گے — ایک دن کنور روسیلم کے ہاں جاتے ہوں کہ چوک میں بے بھاؤ کے پڑ جائیں — بالکل ٹھیک — مگر سلیم ایسا کر بھی دیں گے ؟ — ضرور کر دیں گے وہ تو میرے اوپر جان دیتے ہیں — وہ میرے ہیں — بس — اب کام بن گیا — خوب سوجھی — رہ تو جاؤ بچا جی ! ایسا نلچ نچاؤں کہ — اے ہے ! پیشاب کو بھی اسی وقت ستانا تھا ...."

سرلا پلنگ پر اٹھ کر بیٹھی ہی تھی کہ باورچی دروازے سے جھانکتا نظر آیا — آگے بڑھ کر اس نے کہا "کھانا تیار ہے ."

" ابھی سے ؟ "

" سرکار ! نو بج رہے ہیں — بڑی سرکار کو دودھ دو زمانہ ہوا

جاگے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا۔"

"کیا ماں جی میرا انتظار کر رہی ہیں؟"

"نہیں ــــ سرکار، پلنگ پر سے ہیں وہ دو مان پاؤ اُن کی پٹی کے برابر والی میز پر لگا دیا تھا ــ وہ کھا بھی چکیں....."

"اچھا ــ کھانا لگاؤ" سرلا نے قطع کلام کیا "میں ابھی آتی ہوں"

وہ اُٹھتے ہی ہاتھ منہ دھو کر سے فارغ ہو کر، اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی کھانے کی میز تک پہنچی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پیتل کی بڑی تھالی میں دال کی ترکاری، آلو کا بھرتا، شلجم کی بھجیا اور دہی، چار پیتل کے پیالوں میں رکھا تھا؛ دو چھوٹی تشتریوں میں لیموں کا اچار اور سرکے کی چٹنی تھی، اور بڑی تھالی کے ایک کونے میں دو پراٹھے مڑے ہوئے رکھے تھے۔ سرلا نے ایک نظر ڈالی اور اب اُسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ اُس نے کھانا شروع کر دیا اور زبان ذائقے کی تحریکات دماغ تک پہنچانے لگے۔ ان خارجی تحریکات کو نظر انداز کر کے اندرونی تحریکات سے دست و گریباں ہونا پڑتا تھا اور کبھی کبھار غلبہ بھی میسر آجاتا تھا۔ گویا ان تحریکات سے متاثر ہونے والا دماغ نہیں، بلکہ اس تمام کو دکھ درد یا غم کھا دے کر سمجھنے والی کوئی اور چیز، زیادہ تر خیالات کی طرف متوجہ بعض دفعہ ذائقہ کا لطف بھی حاصل کر لیتی تھی۔

کھانا کھانے میں اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ ماں جی سو گئیں، اس لیے

کھانے سے فارغ ہوتے ہی، کُلّی وُلّی کرنے اور ہاتھ مُنہ پونچھنے کے بعد، وہ پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی اور پلنگ پر دراز ہو گئی۔ دِماغی تلاطم موجود تھا مگر جوار اور بھاٹے کا فرق تھا۔ نفرت اور طیش دور ہوتے جانے والے بادل کی چمک اور گرج کی طرح کم اور دیر دیر میں محسوس ہوتے تھے؛ اُن کے بجائے اُمیدِ انتقام غالب ہو چلی تھی۔ نفسِ درمیانی نے پاے پیچ کا بچھ لیا اپنی جائے پناہ سے گردن اُٹھا کر جھانکنے لگا تھا اور نفسِ شعوری پنجنی کی خاک جھاڑ کر سنبھلنا چاہتا تھا۔ سرلا کو ایک قابلِ عمل تدبیر نظر آنے سے اطمینان نہیں تو اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ اب انتظار تھا تو صُبح ہونے کا، یا سلیم سے ملنے کا۔ البتہ اب کنزُرو کو بُرا بھلا کہنے کے ساتھ، اُس کی تہمت پر غور کرنے کا یُوں ہی سا خیال بھی دو ایک دفعہ ہُوا مگر کیفیتِ غالب نے فوراً ہی اُس کی گردن دبا دی۔ سردار خاں کا خیال آیا، اُس کی گُم شُدہ تصویر یاد آئی اور کایا پلٹ وصیّت ذہن میں آ گئی؛ مگر اِن سب کا سبب محض رام جی کی کرپا نظر آئی اور سلسلۂ فکر کی تان اسی ستم پر ٹوٹی۔

آدھی کے قریب سرلا کی آنکھ لگ گئی۔

اب کیا تھا؟ نفسِ درمیانی یا نفسِ رویاء کا راج تھا۔ اُس نے حافظے کے ٹکڑے، خیالات کے ریزے اور عمل کے پارچے، اپنے عجیب سانچے میں ڈھال کر بازی گر کا تماشہ شروع کر دیا۔

سرلا نے دیکھا کہ:۔

ایک نظر فریب باغیچہ ہے، جس کی روش پر وہ راج کماری کے ساتھ

صبح کے وقت ٹہل رہی ہے۔ یہ روش ایک مرمر کے حوض تک جاتی ہے
جس میں ایک اونچا فوارہ رنگ بدلنے والے پانی کی پھوار حوض کے
باہر تک پہنچا رہا ہے۔ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ
پھولوں کی بھینی بھینی مہک دماغ کو معطر کیے دیتی ہے۔ حوض کے ایک
جانب والی کیاری میں، ہار سنگھار کے درخت کے نیچے کوئی شخص آلتی
پالتی مارے مخملی گھاس پر لحظہ بہ لحظہ اُس کے اوپر ٹپک رہے ہیں۔ وہ
ننگے سر ہے اور اُس کی پشت سرلا کی طرف ہے۔ راج کماری اُس
کیاری کی طرف بڑھتی ہے، مگر سرلا کو حوض کے قریب یہ کہہ کر چھوڑ جاتی ہے
کہ "بس، دیکھ لوں، ہے کون؟ — بیٹی! تم یہیں ٹھہرو۔" سرلا فوارے کی
پھوار سے الگ، روش پر ٹہلنے لگتی ہے۔ راج کماری اُس شخص کے پاس
پہنچ کر، پہلو بہ پہلو، بیٹھ جاتی ہے اور دونوں میں باتیں ہونے لگتی ہیں۔
حرکات سرگوشی کی حدود سے اختلاط تک بڑھتی نظر آتی ہیں اور سرلا سے
ضبط نہیں ہو سکتا۔ وہ "ماں جی! ماں جی!" پکارتی اُس طرف دو
ایک قدم آگے جاتی ہے مگر راج کماری اُس کی طرف متوجہ نہیں
ہوتی۔ بڑھتے بڑھتے قریب ہو جاتی ہے تو اُس شخص کو راج کماری
سے کہتے ہوئے سنتی ہے:

"بے شک — اُس کو دنیا کی محتاجی سے بچانے کے ساتھ
یہ بھی مقصد تھا کہ وہ مجھے جان لے۔ کیا اب بھی جیتے جی نہیں جانے گی
کہ وہ کس کی بیٹی ہے؟ — کبھی اپنی صورت میری تصویر سے نہ ملاتی ہو گی؟

— کیا کہا؟ — تصویر تم نے ....؟ (یہ الفاظ سُننے میں نہ آئے) — وصیت پر تو سوچے گی — مَیں نے اُس میں ...... (پھر یہ الفاظ سُننے میں نہ آئے) — تمہاری وجہ سے وُہ مجھ سے جُدا رہی — اب مرنے پر مَیں اُس سے قریب کیوں نہ ہو جاؤں؟ — مَیں اُس پر ظاہر کیوں نہ ....."

پیچھے سے ایک قہقہہ لگانے کی آواز آئی، سرلا نے گھوم کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر کنور رُوپ کھڑا قہقہے لگا رہا ہے سرلا نے غُصّے کے عالم میں اُس کی طرف بڑھنا چاہا کہ اُس کے پیچھے آدمیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی؛ وُہ تالیاں بجا بجا کر ناچ رہے ہیں۔ سرلا نے گھبرا کر پھر ماں جی کی طرف دیکھا تو وُہ اور دوسرا شخص دونوں غائب۔ اب وہ اِس بھیڑ سے بچنے کے لیئے آگے دوڑتی ہے تو ہار سنگھار کے درخت سے سلیم کُودتا ہے اور اُس کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "ڈرو نہیں! یہاں ہے کون؟" — سرلا اُس کو بتانے کے لئے پُشت کی طرف گھومتی ہے تو وہاں کوئی بھی نہیں — البتہ فوّارے سے پانی کی بجائے آگ نکل رہی ہے؛ انگارے برس رہے ہیں اور شعلے پھیلتے جا رہے ہیں — آگ کی لپٹ قریب آتی جاتی ہے — سرلا خوف سے سلیم کو لپٹتی جاتی ہے — ایک جھٹکا سا لگتا ہے — سلیم اُس کو آغوش میں لیئے ہَوا میں اُڑنے لگا — اُونچے اُٹھتے جاتے ہیں — اور اُونچے — اور اُونچے —

رام جی اور سیتا سونے کے تخت پر بیٹھے اُڑ رہے ہیں — کرشن جی بانسری بجا رہے ہیں اور گوپیاں اُن کے چاروں طرف

لہرا رہی ہیں ــــ رادھا اُڑتی ہوئی آتی ہے اور کرشن جی سے لپٹ جاتی ہے ــ بجلی چمکتی ہے ــ نہایت زور کا کڑاکا ہوتا ہے ــــ

آنکھ کھُل جاتی ہے ــ مگر کچھ سُجھ میں نہیں آتا ــ سامنے والی دیوار کی سفیدی پر بجلی کی روشنی ــ مگر دیوار کا احساس نہ دارد۔

ایک لمحے کے بعد، دیوار نظر آتی ہے؛ اپنا کمرہ سمجھ میں آتا ہے؛ خواب سے آنکھ کھُلنے کا خیال آتا ہے ــ مگر آواز نہیں نکل سکتی۔ دل کی دھڑکن کا پتہ چلتا ہے؛ سانس کی تیزی محسوس ہوتی ہے؛ کروٹ بدلنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ــ مگر ہلا نہیں جاتا۔

دوسرے لمحے کے بعد، خواہش ارادہ بنتی ہے؛ ارادہ عمل بنتا ہے۔ سیدھے بازو کو حرکت ہوتی ہے اور سر لاٹلی کروٹ سے چیت ہو جاتی ہے۔

" میں نے کیا دیکھا؟ ــ یہ سردار خاں تھے؟ ــ شکل تو دیکھی نہیں، البتہ بات چیت سے یہی پتہ چلتا ہے۔ اِس سپنے کی بوجھ کیا؟ ــ کچھ بھی نہیں ــ جس خیال میں سوئی وُہی دیکھ لیا؛ آخر کنٹر رو کے بیچ بازار ہیر جوتے پڑتے کیوں نہیں دیکھا؟ ــ یہ باغ، یہ فوارہ، یہ آگ کی لپٹیں ــ یہ کیا تھا؟ ــ یہ چیزیں تو میرے خیال میں بھی نہیں تھیں۔ یہ سب کہاں سے آگئیں؟ ــ کہتے ہیں، سپنا بعض دفعہ سچا بھی ہوتا ہے ــ مگر جھوٹا بھی تو ہوتا ہے؟ ــ سچا یاد رہتا ہے، جھوٹا یاد نہیں رہتا...... "

سرلا نے خواب دُہرایا ۔ وہ اول سے آخر تک اُس کے حافظے میں موجود تھا۔ پھر بھی اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ صبح کو یاد رہے تو سچا ہو سکتا ہے سیدھی کروٹ لی اور سو جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن خواب کے الفاظ "کیا اب بھی جیتنے جی نہیں جانے گی کہ وہ کس کی بیٹی ہے؟" اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونا چاہا:

"پتاجی کان پور سے کل پرسوں تک ضرور آجائیں گے ۔ کل روپیہ لیکر آئیں گے ۔ پانچ لاکھ!۔

مگر کوٹھی، فرنیچر، اُچاپت اور تنخواہیں ۔ پھر موٹر کے دام، اور مقدمے کا خرچ ۔ ایک لاکھ تو اس میں برابر ہو جائے گا ۔ کیا پتاجی موٹر کے دام اور مقدمے کا خرچ لیں گے؟ نہ کیوں لیں گے؟ ۔ اُنہوں نے اپنی رقم سے خرچ کیا ہے۔ اور یہ سب دھن کس کا ہے؟ ۔ اُن کا نہیں ہے، میرا ہے ۔ وصیت سے مجھے ملا ہے ۔ مگر ملا تو اُن ہی کے دوست سے ہے! اُن ہی کی وجہ تو ہوئی ۔ پھر اُن ہی کو کیوں نہیں دیا؟ مجھے کیوں دیا؟ ۔ وصیت نامے میں مجھے اپنی بیٹی لکھا ہے اور اپنی بیٹی کو دیا ہے۔ گود لے لیا تو بیٹی ہو گئی ۔ پھر گود لی ہوئی بیٹی کیوں نہیں لکھا؟ ۔ اس لیئے نہیں لکھا کہ گود لینا مسلمانوں میں نہیں ہوتا ۔ اُن کے بھتیجے وصیت کو ناجائز کرا دیتے۔ کچھ بھی ہو، میں سردار صاحب کا گن جیتنے جی نہیں بھول سکتی ۔ اُن کو مجھ سے

سچّی محبّت تھی ۔ آخر مجھے نیند کیوں نہیں آتی ؟"
سرلا نے آنکھیں کھول دیں ۔ وُہی دیوار، وُہی بجلی کا بلب، وُہی کمرہ اور وُہی تنہائی ۔ شاید بجلی کا بلب سامنے ہونے پر نیند نہیں آتی ۔ اُس نے پھر اُلٹی کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کر لیں :
"سردار صاحب جیسے بھلے مانس دُنیا میں بہت کم ہوتے ہیں ۔ اپنی زبان کے پیچھے اپنے بھتیجوں کا خیال نہیں کیا ؟ مجھے زبان سے بیٹی کہہ دیا تو اُس کو مر کر بھی نبھا ہا ۔ اُن کی تصویر جاتی رہی ، نہیں تو اُسے انلارج کرا کے اپنے کمرے میں لگاتی ۔ وہ تصویر گئی کہاں ؟ ماتا جی نے اِدھر اُدھر کہیں ڈال دی ۔ آج ضرور ڈھونڈوں گی ۔ ہاں ! پہہ کیا کہتے تھے ؟ اپنی صورت میری تصویر سے نہیں ملائے گی ؟" ۔ کیا میری صورت اُن سے ملتی جلتی ہے ؟ ۔ میں نے تو کبھی ملائی نہیں ۔ تصویر مل جائے تو اب ضرور ملاؤں گی ۔ اور ملتی جلتی ہوئی تو ؟ ......"
ایک لگاتار آواز دور سے سننے میں آئی ۔
"...... کیا مِل کی سیٹی ہے ۔ مزدوروں کے جگانے کے لیے ؟ ۔ صبح ہونے والی ہے ؟"
سرلا نے آنکھیں ہی نہیں کھولیں بلکہ غور سے آواز پر کان لگائیے سیٹی برابر بج رہی تھی ۔ اُس نے پہچانا بھی اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ؟
سنگھار میز پر ٹائم پیس رکھی تھی ۔ سرلا نے دیکھا تو وہ پانچ بجا رہی تھی ۔
"اہا ! پانچ بج گئے !" ۔ اُس نے انگڑائی لی ۔ "اب بھی صبح

ہونے ہیں وہ دو گھنٹے ہوں گے۔" وہ پھر واپس آکر پلنگ پر لیٹ گئی، مگر اب سو جانے کی کوشش جا چکی تھی۔" ایسے اندھیرے سے مزدوروں کو جگا دیتے ہیں۔ بیچاروں کو رات بھر بھی چین سے سونے نہیں دیتے۔ بس مل رات دن چلتی رہے۔ کیوں؟۔ روپیہ زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔ لکھ پتی کروڑ پتی بن جائیں، پر مزدور ہڈیاں پیلتے پیلتے مر جائے اور چین نہ پائے۔ ہائے مایا! مایا!۔ ہے ایشور! تم کیسے ہو؟ ۔ یہ سرشٹی تم نے کس ڈھب سے رچائی ہے؟۔ میں نے ایک شعر پڑھا تھا۔ کیا تھا؟۔ ہاں۔

ایک کو مرتے تک نہیں دیتے :: ایک اُکتا گیا لیتے لیتے!"

۔ مجھے تو چھپّر پھاڑ کے دیا اور بہت دیا۔ میرے پہلے جنم کا بھوگ ہے کہتے ہیں پچھلے جنم کا بیری اولاد بن کر پیدا ہوتا ہے کہ ماتا کا خون پیئے اور پتا کا سب مال و دولت لوٹ لے۔ مگر میں نے تو پتا جی کا مال نہیں لیا۔ سر دار صاحب کا لیا۔ کیا میں پچھلے جنم میں اُن کی دشمن تھی؟۔ لیکن میں اُن کی اولاد بن کر تو پیدا نہیں ہوئی۔ بے شک! سلیم سچ کہتے تھے۔ مجھے کیا معلوم کہ میں کس کی اولاد ہوں۔ وہ اور کیا کہتے تھے؟۔ زُہرہ ہردے نرائن کی ملازم تھی..... مُشتری ہردے نرائن سے ملتی جلتی ہے...... ہردے نرائن نے اپنی جائداد مشتری کو وصیت کی ہے۔ میرے معاملے میں کیا سمجھا جائے؟۔ یہی تو کشن رُو بھی کہتا تھا۔ کہتا ہے باجی۔ سمجھوتا میری ماتا کیوں کسی کی ملازم ہوتیں۔ مگر وصیت کی بات تو ویسی ہی ہے۔

پر میری صورت تو سردار صاحب کی سی نہیں — ابھی کیا معلوم؟ — تصویر مل جائے تو دیکھوں — اور ملتی جلتی ہوئی تو؟ ......"

سر لا کروٹ سے چت ہو گئی اور خیالات کی رو بھی بدل گئی۔

"سلیم مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں؟ — ضرور کرتے ہیں، مجھ پر جان دیتے ہیں۔ وہ ریڈ کلف کی کسی لڑکی کو منہ نہیں لگاتے تھے — کئی لڑکیاں اُن کو پھانسنا چاہتی تھیں — قدسیہ تو ہر وقت اُن کے گلے کا ہار بننے پر مائل تھی — اُس نے اپنی تصویر بھی سر ہو ہو کر سلیم سے بنوائی اور اس بہانے سے اُن کے ہاں جاتی بھی رہی — مگر وہ قدسیہ کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوئے — آخر میں وہ مجھ سے جلنے لگی تھی — جلا کرے، مجھے کیا پروا — سلیم تو اوّل دن سے ہی مجھ پر مائل رہے؛ اُنھوں نے میری تصویر خود بنائی اور مجھ سے چھپایا؛ وہ مجھے کبھی نہ دکھاتے اگر میں زبردستی نہ دیکھ لیتی — تصویر نہایت عمدہ بنائی — میں تو اُسے دیکھ کر شرما گئی — شرمائی تو ضرور مگر پھر بہت خوش بھی ہوئی — کیا میں ایسی ہی حسین ہوں جیسی اُس تصویر سے معلوم ہوتی ہوں؟ — اگر ہوں تو بھی سلیم کو تعجب بجا ہے — اُن پر ہی کیا موقوف پچھلو، بخشی، باقر اور باجپئی سب مجھ پر فدا ہیں — مگر میں کسی کو منہ نہیں لگاتی — سلیم کی سی بات کسی میں نہیں — کالج کے زمانہ کے لونڈوں کو چھوڑ کر یہ سب اُس وقت سے میرے گرد چکر لگاتے ہیں جب سے مجھے دولت مل گئی ہے — سلیم تو مجھ پر اُس دن سے فدا ہوئے جب اُنھوں نے مجھے جانکی کُنڈ پر دیکھا — وہ تو میری دولت کے بعد کچھ کنارہ کرنے لگے — مگر مجھ

رام جی نے دھن خوب دیا۔۔۔ سردار صاحب نے ولا دیا۔ کیا میں سردار صاحب کو اتنی پیاری تھی؟
کیوں؟۔ کیا میں صورت شکل میں اُن سے ملتی جلتی ہوں؟۔ اور ملتی جلتی ہوئی تو؟۔۔۔"

شاید اس سوال کے بار بار نمودار ہونے سے وہ بے چین ہو کر اُٹھ بیٹھی! بجلی کے بلب میں زردی پیدا ہو چلی تھی، غالباً صبح ہونے والی تھی۔ وہ کچھ سوچتی رہی اور آخر کھڑی ہو گئی۔ غسل خانے میں پہنچی، نل کی ٹونٹی کھول کر لٹیا بھری اور پاخانے میں داخل ہو گئی۔ ذرا بیٹھنے تک پہنچ کر خیال آیا کہ ابھی حاجت کا پتہ بھی نہیں۔ لٹیا وہیں چھوڑ کر واپس آئی اور کمرے سے گزر کر دالان میں نکل گئی۔ روشنی کا شاطر مشرق کی طرف سے بساط گردوں پر قبضہ کرتا نظر آتا تھا؛ شب تاریک کے چمکتے ہوئے مہرے بہت کچھ اُلٹ چکے تھے؛ پیچھے مغرب کی طرف ہٹتے جا رہے تھے؛ ایک نیا بنا ہوا مہرہ آدھے آسمان سے کچھ نیچے ابھی دمک رہا تھا مگر نقشہ ایسا تھا کہ تاریکی کو شاطر کو دو چار چالوں میں مات ہونے والی تھی۔ سرلا آسمانی کیفیت یوں ہی سی دیکھ کر کسی خیال میں ڈوبی ہوئی راج کماری کے کمرے کی طرف بڑھی، آہستہ سے کواڑ کھول کر دبے پاؤں اندر گئی؛ پلنگ تک جا پہنچی۔ راج کماری دیوار کی طرف کروٹ لئے، چادر اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔ اُس کی پٹی کے پاس چھوٹی سی تپائی پر آدھا انار ایک طشتری میں رکھا تھا اور چبائے ہوئے دانوں کا پھوک دوسری طشتری میں پڑا تھا۔ سرہانے تکیے کے پہلو میں کوئی چیز رومال سے ڈھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سرلا نے آہستہ آہستہ رومال ہٹایا تو اُس کے نیچے ایک چوکھٹا اوندھا کھلا! اُس نے چپکے سے چوکھٹا اُٹھا کر دیکھا تو سردار خاں کی تصویر تھی!

سرلا تصویر لیئے دبے پاؤں واپس ہوئی اور دروازے سے چور کی طرح نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ پلنگ پر بیٹھتے ہی خود کلامی شروع ہو گئی۔

"یہ تصویر ماتا جی کے سرہانے کیوں رکھی؟ اور رومال کے نیچے

چھپانے کی کیا وجہ تھی ؟ ــ وہ تو کہتی تھیں کہ چوکھٹا ٹوٹ گیا اور تصویر گم گئی
یہ تو بالکل صحیح سلامت ہے ـ کیا ماتا جی مجھ سے جھوٹ بولیں ؟ ــ تصویر چھپانے
سے کیا مطلب ؟ ــ کب سے چھپائی ؟ ــ سردار خاں کی وصیت کا تار آنے
کے بعد سے ـ کیا وصیت نامے سے کوئی بھید کھل جانے کا خوف تھا ؟ یہ بھی سہی
تو تصویر کو چھپانے سے تو وہ بھید نہ چھپتا ؛ بُرا کہنے والے تو بُرا کہنے سے
نہ چُوکتے ؛ اُن کی تصویر کی نہ تلاش ہے نہ ہوتی ؛ تلاش تو صرف مجھے تھی ۔
تو کیا صرف میری وجہ سے تصویر چھپائی گئی ؟ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ، یہ
کیوں ؟ ــ کیا ماتا جی کو یہ خوف تھا کہ کہیں میں اپنی صورت تصویر سے
نہ ملاؤں ؟ ــ "

وہ فوراً پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور سرہانے لگی ہوئی سنگھار میز
کے پاس جا پہنچی ـ تصویر ہاتھ میں تھی اور آئینہ سامنے تھا ! نظر دوڑ رہی تھی اور
بے چین تھا ـ

" وہی گول چہرہ وہی گندمی رنگ ؛ وہی اونچی ناک ؛ وہی غلافی اور سیاہ
پتلیوں والی آنکھیں ؛ وہی کشادہ اور کسی قدر کھلا رہنے والا دہانہ ؛ بلکہ ٹھوڑی
پر ویسا ہی تل ! یہ کیا ؟ یہ کیا ؟ کیا میں سردار خاں کی
لڑکی ہوں ؟ "

سرلا نے تصویر سنگھار میز پر ڈال دی اور خود کرسی پر بیٹھ گئی ـ سینے میں
آگ ، دماغ میں اُلجھن ، دل میں دھڑکن ! سرلا نے دونوں ہاتھ
سنگھار میز پہ رکھ کر سر ٹیک دیا ؛ دم گھٹا ، کلیجہ منہ کو آیا اور وہ

روسنے لگی۔

عمارت کے باہر تاریکی بھی شبنمی آنسو بہاتی رخصت ہو رہی تھی،
کائنات بیدار ہوتے ہوئے روشنی کی جمائیاں لے رہی تھی اور وجود است
شب خوابی کا لباس سہانے رنگ میں اتار رہی تھی۔ ٹائم پیس ٹک ٹک کر رہی
تھی اور سوئیاں سرک رہی تھیں۔ سرلا روتی رہی جب تک کہ دل کی بھڑاس
نہ نکل گئی۔ یا دو گھنٹے میں اس نے سر اٹھایا تو چہرے اور آنکھوں کا کچھ اور ہی
عالم تھا۔ آئینے پر نظر پڑی تو راج کماری ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا
لیئے، کرسی کے پیچھے کھڑی نظر آئی۔ وہ غور سے کے ساتھ میز پر پڑی ہوئی تصویر
کو اور سرلا کو دیکھ رہی تھی۔

سرلا دفعتاً کھڑی ہوئی، فوراً مڑی اور بے ساختہ راج کماری سے
مخاطب ہوئی؛

"ماں جی! یہ کیا ہے؟"

"کیا؟"

"کیا ہیں؟ — کیا ہیں؟ — (سردار خاں کی تصویر کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) — کیا یہ؟

راج کماری خاموش تھی — اس کی نظریں نیچی تھیں —

"ماں جی! — ماں جی! — کیا ہیں ان کی — ؟"

سرلا اپنا سوال بھی پورا نہ کر سکی تھی مگر راج کماری سمجھ چکی تھی۔ سب کچھ سمجھ
چکی تھی۔ بری طرح سمجھ چکی تھی۔ اس کے جسم میں رعشہ پیدا ہوا۔ سر چکرایا، پیر

لڑکھڑائے، اور وہ دھڑام سے منہہ کے بل زمین پر گری۔

سرلا جھپٹی، اُس نے ماں جی کو سنبھالا، مگر وہاں جسم ہی جسم تھا۔ ماں جی بننے والی چیز نہ تھی؛ سرلا لاش کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ڈری اور گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی کہ نوکروں کو بلائے۔ تمام کوٹھی میں سناٹا تھا۔ البتہ نوکروں کی کوٹھریوں سے کچھ آواز آ رہی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی کوٹھی کے احاطے کی طرف لپکی۔ چوکیدار ندارد تھا اور مالی کی کوٹھری بند تھی۔ البتہ شوفر کی کوٹھری کا ایک کواڑ کھلا تھا اور شاید باورچی، چوکیدار اور مالی بھی وہیں تھے۔ کوٹھری کے اندر سریلی اور زنانی آواز گا رہی تھی:-

"میرے کام آئی، دلِ مایوس! ناکامی تری!"

(غالب)
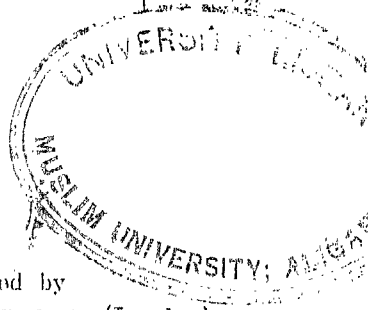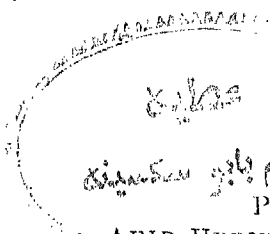
Printed by
ABID UDDIN F. R. S. A. (London)
AT THE
NIZAMI PRESS, BUDAUN.